اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن ، اپنا تو بن

سراغِ زندگی

علامہ اقبالؒ کے اشعار پر مبنی بچوں کے لیے کہانیاں

محمد نوید مرزا

سراغِ زندگی

علامہ اقبالؒ کے اشعار پر مبنی بچوں کے لیے کہانیاں

انتخاب
محمد نوید مرزا

انتخاب

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

ناشر

محمد سہیل عمر

ناظم اقبال اکادمی پاکستان

چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور

Tel#: [92 42] 631 4510

Fax#: [92-42] 631 4496

Email: iqbalacd@lhr.comats.net.pk

Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 969-416-358-7

طبع اوّل: ۲۰۰۶ء

تعداد: ۱۰۰۰

قیمت: ۲۵۰ روپے

کمپوزنگ، صفحہ بندی

اور تصویریں: ایجوکیشنل ریسورس ڈیولپمنٹ سینٹر، کراچی

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

اس کتاب کی طباعت و اشاعت حکومت پنجاب، محکمہ اطلاعات و ثقافت
کی مالی معاونت کی بدولت ممکن ہوئی۔

انتساب

نئی نسل کے نام

جن سے

علامہ اقبالؒ کی بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں

تعارف

''سراغِ زندگی'' علامہ اقبال کے اشعار کی روشنی میں بچوں کے لیے لکھی گئی بارہ (۱۲) کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان طبع زاد کہانیوں میں شاعرِ مشرق کے شعری افکار کو سامنے رکھتے ہوئے اُن کی سوچ، فکر اور پیغام کو اجاگر کیا گیا ہے اور مختلف موضوعات کی ان کہانیوں کے ذریعے نئی نسل کی رہنمائی کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

محمد نوید مرزا

فہرست

۱	سُراغِ زندگی	۱
۲	علم کی شمع	۹
۳	اُس رزق سے موت اچھی	۱۵
۴	خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں	۲۳
۵	شہید	۲۹
۶	مُقدر کا ستارہ	۳۷
۷	ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات	۴۵
۸	زندہ تمنا	۵۳
۹	ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند	۵۹
۱۰	میرِ کارواں	۷۰
۱۱	غیرت ہے بڑی چیز	۷۷
۱۲	مُسلمان	۸۸

سراغِ زندگی

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن ، اپنا تو بن

آدھی رات کا وقت تھا۔ایک سایہ پولیس سے چھپتا چھپاتا ایک بوسیدہ پرانے مکان میں داخل ہُوا۔ یہ شہر کا بدنام نقب زن جمیل تھا۔اُس کی گرفتاری پر پچیس ہزار روپے کا انعام مقرر تھا۔تھوڑی دیر پہلے وہ سیٹھ عادل کی کوٹھی میں چوری کی نیت سے داخل ہونا چاہتا تھا کہ گشت کرتی ہوئی پولیس نے اسے دیکھ لیا۔ وہ پولیس کو دھوکا دے کر اس پرانے مکان میں آ گیا تھا۔اب اس نے چھپنے کے لیے ایسی جگہ تلاش کر لی تھی جہاں اُسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک کمرے سے رونے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایک عورت کی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی:

''خدا کے واسطے میرے بیٹے کو بچاؤ، اگر اُسے کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔''

''ڈاکٹر نے اس کے آپریشن کے لیے بیس ہزار روپے کی رقم کا بندوبست کرنے کو کہا ہے۔تم تو جانتی ہو میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔'' ایک مردانہ آواز آئی۔

''تم کوشش تو کرو شاید کسی دوست سے ادھار مل جائے۔'' عورت کی روہانسی

آواز سنائی دی۔

''مصیبت کے وقت کوئی دوست بھی کام نہیں آتا۔ میں نے ہر جگہ کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔ ریحان میری بھی اولاد ہے۔ میں خود بہت پریشان ہوں۔ تم دعا کرو۔ شاید خدا کوئی سبب بنا دے۔''

''چاہے کچھ بھی کرو، چوری کرو، ڈاکا ڈالو۔ مُجھے اپنے بیٹے کی زندگی چاہیے۔'' عورت مسلسل پریشانی کے عالم میں بولتی جا رہی تھی۔ جمیل یہ گفتگو سن کر ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا۔ دس سال پہلے وہ ایک معمولی مزدور تھا۔ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ اس کی بیوی سلمٰی ایک صابر و شاکر عورت تھی۔ دونوں میاں بیوی تنگ دستی میں بھی اپنے اکلوتے بیٹے عاصم کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ ایک دن جمیل مزدوری کر کے گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ عاصم شدید بخار میں مبتلا ہے جمیل فوراً عاصم کو قریبی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے عاصم کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ اُسے نمونیا ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے جمیل کو دوائیں لکھ کر دے دیں۔ جمیل کے پاس ڈاکٹر کی فیس ادا کرنے کے بعد دواؤں کے لیے مزید پیسے نہ تھے۔ اُس کی بیوی بیٹے کی حالت دیکھ کر مسلسل روئے جا رہی تھی۔

پریشانی کے عالم میں جمیل کو اور تو کچھ نہ سُوجھا، بس چوری کرنے کا خیال آیا۔ چوری کا ارادہ کر کے گھر سے نکلا۔ وہ ایک عالی شان کوٹھی میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا کہ پولیس نے دیکھ لیا۔ وہ پولیس کی گرفت میں آئے بغیر سیدھا اپنے گھر پہنچا مگر اُس

وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی ۔ گھر کا منظر انتہائی کرب ناک تھا۔ بروقت دوائی نہ ملنے کی وجہ سے عاصم کا بخار شدید ہو گیا تھا۔ اتنا شدید کے وہ کچھ دیر پہلے انتقال کر چکا تھا۔ جمیل کے سامنے اب اُس کے بیٹے کی لاش پڑی تھی ۔ دوسری طرف اُس کی بیوی سلمٰی دیواروں سے سر ٹکرا کر خود کو لہولہان کر چکی تھی ۔ جمیل نے اُسے سنبھالنا چاہا، مگر اُسے چین نہ آیا۔ اِسی صدمے کی وجہ سے سلمٰی کا بھی انتقال ہو گیا۔ جمیل کے لیے وہ لمحے انتہائی اذّیت ناک تھے ۔ اُس نے پیسوں کے لیے غلط راستہ اختیار کرنا چاہا تھا۔ شاید یہ اُس عمل کی سزا تھی ۔ اُسی وقت پولیس بھی اُسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ چکی تھی ۔ جمیل اب پولیس کی تحویل میں تھا۔ جمیل نے اُنھیں اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کی اور پولیس کو بتایا کہ اس کے بیٹے کی بیماری کے علاج کے لیے اس کے پاس رقم نہیں تھی ۔ اس لیے وہ یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوا۔

گرفتاری کے بعد جمیل کو صرف اتنی مہلت دی گئی کہ وہ اپنی آنکھوں سے بیوی اور بچے کو دفن ہوتا دیکھ سکے ۔ اس موقعے پر اس کے چند رشتے دار اور محلے کے افراد بھی موجود تھے ۔ ہر آنکھ اشک بار تھی ، لیکن کوئی بھی جمیل کی مدد نہ کر سکا۔

پولیس جمیل کو اپنے ساتھ لے گئی ۔ عدالت میں جُرم ثابت ہونے پر اسے چھ ماہ کی قید کی سزا سنا دی گئی ۔ رہائی کے بعد بدقسمت جمیل پیشہ ور چور بن گیا۔ وہ یہ سوچ چکا تھا کہ چوری اور ڈاکے کو اپنا پیشہ بنائے گا اور اس طرح معاشرے سے انتقام لے گا۔ لیکن وہ ایسا نرم دل واقع ہوا تھا کہ اُس نے آج تک کسی غریب کو تنگ نہیں کیا تھا۔ وہ امیروں اور وڈیروں کے گھر چوری کرتا، اس لیے پیسے والے لوگ اس سے

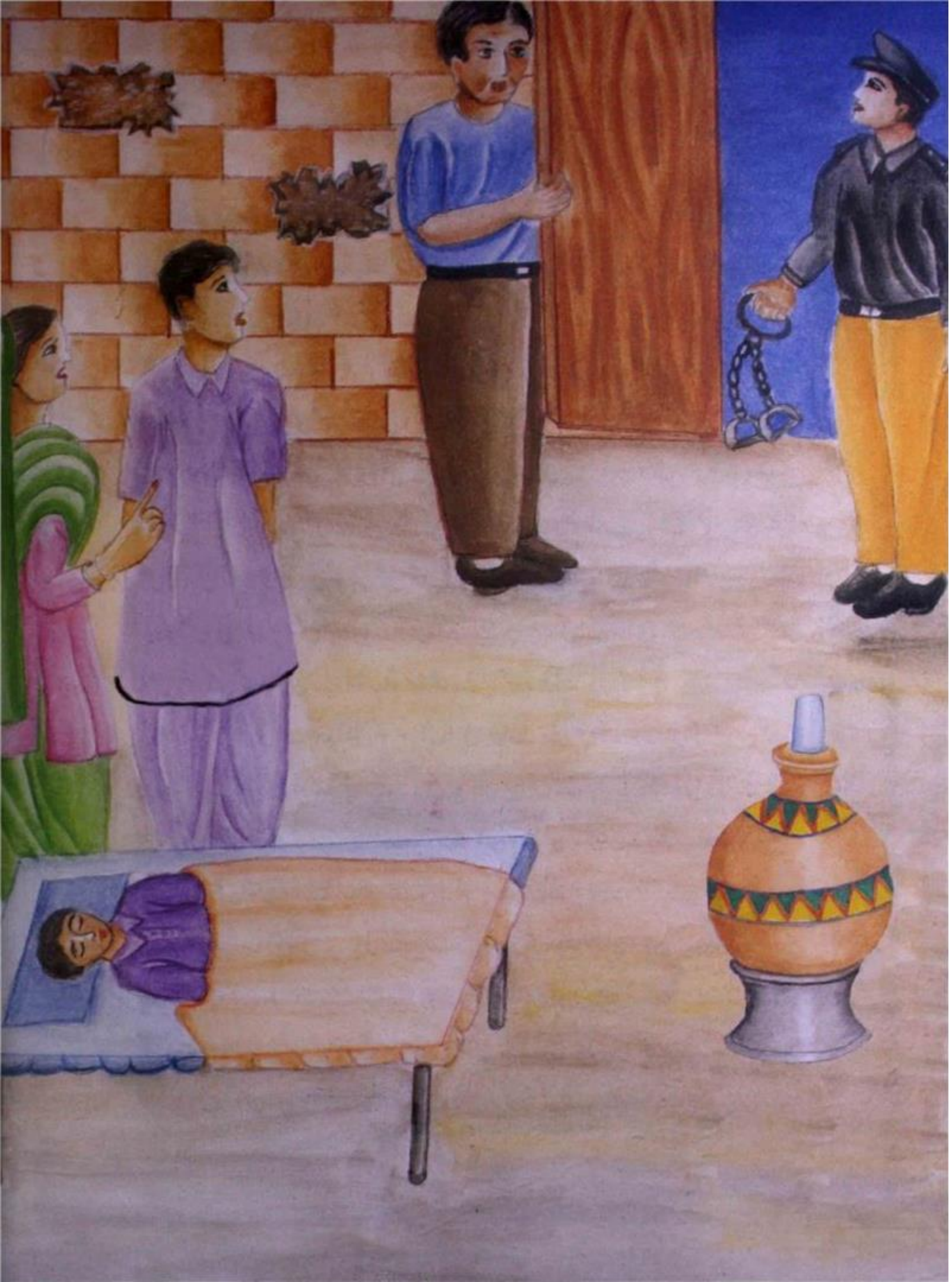

ہمیشہ خوف زدہ رہتے تھے۔ پولیس نے اُس کی گرفتاری کے لیے پچیس ہزار روپے انعام مقرر کیا تھا مگر وہ ابھی تک گرفتار نہیں ہوا تھا۔

جمیل جب خیالوں کی دنیا سے واپس آیا تو اُس نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے دروازہ کھلا۔ کمرے میں موجود میاں بیوی اُسے دیکھ کر خوف زدہ ہوگئے۔ پھر مرد ہمت کر کے بولا۔ ''در..... دروازہ ..... باہر کا .....در .....وازہ تو بند تھا.....تم آخر اندر کیسے آ گئے؟ تم کون ہو.....اور کیا چاہتے ہو؟''

''میں دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوا ہوں؟'' جمیل نے بتایا۔

''تت .....تو.....تم کوئی چور یا ڈاکو ہو.....لل .....لیکن ہمارے گھر میں تو کوئی قیمتی چیز موجود نہیں۔'' عورت ہکلاتے ہوئے بمشکل بولی۔

جمیل نے اُنھیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اب تو وہ زیادہ ڈر گئے۔ وہ تو پہلے ہی بیٹے کی بیماری کی وجہ سے پریشان تھے۔ ریحان شدید بخار کی وجہ سے نیم بے ہوش ہو چکا تھا اور اُسے فوری علاج کی ضرورت تھی۔ جمیل نے اُنھیں اپنی بیوی اور بیٹے کی موت کی ساری کہانی سنائی۔ جمیل سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد دونوں میاں بیوی کا خوف دور ہوا۔ دونوں کی کہانی ایک جیسی تھی۔ جمیل چاہتا تھا کہ اِن پریشان حال میاں بیوی کی مدد کرے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان دونوں میاں بیوی کی زندگی ایسے ہی تباہ ہو جیسے اُس کی اپنی زندگی تباہ ہوئی تھی۔ یہ سوچ کر جمیل نے اُن سے کہا:

''تم مجھے گرفتار کروا دو میری گرفتاری پر پچیس ہزار روپے انعام مقرر ہے۔

اس رقم سے تم اپنے بیٹے کا علاج کروالینا۔ میرے ساتھ زیادہ بحث مت کرنا۔ اسی میں میری خوشی ہے۔''

''ہم تمھیں گرفتار کیسے کروا سکتے ہیں۔ وہ شخص بولا، ہم اتنے ظالم نہیں کہ اپنے بیٹے کے علاج کی خاطر تمھیں پولیس کے حوالے کردیں''۔ ابھی وہ باتیں ہی کررہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''باہر یقیناً پولیس ہے۔''۔ جمیل نے کہا۔ ''تم چھت پر چلے جاؤ اور پائپ سے لٹک کر یہاں سے بھاگ جاؤ۔'' عورت نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ مرد نے بھی تائید میں سر ہلا دیا۔

جمیل کے اندر بدی کے تاریک بادل چھَٹ چکے تھے اور نیکی کا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اُس کے اندر کسی کے کام آنے کا جذبہ پوری طرح جاگ گیا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس نے اپنے من میں ڈوب کر سُراغِ زندگی کو پالیا ہے۔ لہٰذا اُس نے کمرے سے نکل کر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ پولیس اندر داخل ہوئی اور اُسے گرفتار کرلیا۔ پولیس نے ضروری کارروائی کے لیے اُس مرد کو بھی ساتھ لے لیا۔ جمیل نے اُسے چپ رہنے کو کہا اور اعلیٰ افسروں کے سامنے ایک فرضی کہانی سنا دی۔

ایک پولیس اہلکار نے مرد کا نام اور پتا نوٹ کرلیا۔ اس مرد نے اپنا نام خالد بتایا تھا۔ جمیل کی جیب میں اُس وقت دو ہزار روپے موجود تھے۔ اس نے یہ رقم خالد کو دیتے ہوئے کہا کہ اس سے وہ اپنے بچے کا ابتدائی علاج کروائے اور انعام کی رقم ملتے ہی کسی اچھے ہسپتال میں لے جا کر دکھائے۔

جمیل کو عدالت سے سزا سنا کر جیل بھیج دیا گیا۔ چند دنوں بعد اُس انعام کی رقم بھی خالد کو مل گئی۔ خالد نے اپنے بیٹے کو ہسپتال میں داخل کروا دیا، جہاں مناسب دیکھ بھال اور علاج معالجے کے بعد وہ تیزی سے صحت یاب ہونے لگا۔

جمیل بہت خوش تھا کہ اُس کی وجہ سے ایک گھر تباہی سے بچ گیا۔ ورنہ ہوسکتا تھا کہ جمیل کی طرح خالد بھی اپنے بیٹے کی زندگی بچانے کے لیے کوئی ناجائز طریقہ استعمال کرتا اور اُس کا حشر بھی جمیل جیسا ہوتا اور وہ جرم کے راستے پر چل پڑتا۔ خالد اور اس کی بیوی اپنے محسن جمیل کو نہیں بھُولے تھے۔ وہ باقاعدگی سے اُسے ملنے

جیل جایا کرتے تھے۔ صحت یاب ہونے کے بعد نہار ریحان بھی اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔
جمیل کے من کی دنیا مکمل طور پر تبدیل ہو چکی تھی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ رہا ہونے
کے بعد اپنے ہاتھوں سے محنت مزدوری کر کے حلال روزی کمائے گا اور لوگوں کی
خدمت کو اپنا اوّلین فرض سمجھے گا۔

علم کی شمع

زندگی ہو میرے پروانے کی صُورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

ناصر اور عابد دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ عابد کو پڑھائی سے بالکل دلچسپی نہیں تھی جب کہ ناصر اپنی کلاس کا ذہین طالب علم تھا اور ہمیشہ امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتا تھا۔ ناصر کا تعلق ایک متوسط خاندان سے تھا جب کہ عابد ایک کھاتے پیتے امیر گھرانے کا فرد تھا اور اُس کے والد کا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ پیسے کی فراوانی نے اُسے قدرے مغرور بنا دیا تھا اور وہ دولت کو اس قدر اہمیت دینے لگا تھا کہ اُس کی نظر میں تعلیم کی اہمیت تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ وقت گزرتا رہا اور دونوں میٹرک میں پہنچ گئے میٹرک کا امتحان ناصر نے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا جب کہ عابد نے تھرڈ ڈویژن حاصل کی اور تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ اسکول سے نکلتے ہی سب ساتھی ایک دُوسرے سے جُدا ہو گئے۔

ناصر اپنے تعلیمی مراحل طے کرتا رہا اور ایم اے اُردو کے امتحان میں نمایاں طور پر کامیابی حاصل کر لی۔ بعد میں اُسے ایک مقامی کالج میں بحیثیت لیکچرار ملازمت مل گئی۔ وہ اُردو کا اُستاد تھا۔ کلاس میں اردو زبان کی اہمیت اور افادیت بیان کرتا، اردو ادب کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر

روشنی ڈالتا تھا۔ وہ کالج کے طلبہ میں بہت مقبول تھا۔

علامہ اقبال اُس کے پسندیدہ شاعر تھے اور وہ اقبال کی شاعری بڑی خوبصورتی سے پڑھاتا۔ وہ اپنے طالب علموں کو اقبال کی شاعری اور افکار پر عمل کرنے کی نصیحت کرتا اور اُنھیں اپنی تعلیم پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینے پر زور دیتا تھا۔ وہ بتاتا کہ علامہ اقبال کو نوجوانوں سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں نئی نسل کو علم کی شمع سے محبت کرنے کی نصیحت کی ہے۔ ناصر اُنھیں علم کی اہمیت کے بارے میں بتاتا اور اکثر کہتا تھا کہ ہمارے حضور اکرمؐ کا فرمان ہے، ''علم حاصل کرو چاہے تمھیں چین ہی جانا پڑے۔ وہ اپنے شاگردوں سے کہتا کہ ہمیں اپنے نبی پاکؐ کے اس عظیم ارشاد کی روشنی میں زندگی کے ہر مرحلے میں دینی اور دُنیاوی علم حاصل کرنا چاہیے اور اپنی تمام عمر علم کے حصول کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔

ایک دن وہ اپنے طلبہ کو لیکچر دے کر کلاس سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک اجنبی شخص اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بڑی عاجزی سے بولا ''جناب میں میٹرک پاس ہوں۔ آپ کے کالج میں اگر کوئی نوکری ہو تو مجھے خدمت کا موقع دیں۔ میں ساری زندگی آپ کا احسان مند رہوں گا۔ یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ناصر نے ایک نظر اُس شخص کو دیکھا، جیسے کچھ پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُس شخص کے بال بکھرے ہوئے اور ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اُس نے میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور چہرے سے مفلسی کے آثار نمایاں تھے۔ ناصر نے اُسے غور سے دیکھا اور پھر چونک پڑا۔ اُس کے منہ سے حیرانی کے عالم میں نکلا:

''ارے عابد..... یہ تم ہو..... اور یہ کیا حال بنا رکھا ہے..... ! آخر یہ سب کیا ہے؟''

ناصر کے منہ سے اپنا نام سن کر عابد چونک پڑا اور بوکھلا گیا۔ وہ اپنے کلاس فیلو ناصر کو پہچان کر اپنی داستان سنانے لگا: ''ناصر تم نے ٹھیک پہچانا..... میں عابد ہوں..... حالات کا مارا ہوا..... تم مجھے تعلیم کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ علم کے حصول کے لیے ساری عمر سرگرم رہنا چاہیے لیکن میں دولت کے غرور میں تمھاری بات سنی ان سنی کر دیتا تھا۔ میں نے میٹرک کے بعد تعلیم کو خیر باد کہا اور اپنے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ پڑھائی سے تو میری شروع ہی سے جان جاتی تھی اور میں تمھیں بھی یہی کہا کرتا تھا کہ پیسے کے مقابلے میں تعلیم کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ سراسر میری غلطی تھی۔ ان ہی دنوں میرے ابا جان کاروبار کے سلسلے میں دوسرے شہر جا رہے تھے کہ کار کا حادثہ ہو گیا اور وہ ہمیں بے یارو مددگار چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔ ہم پر بڑا مشکل وقت آن پڑا تھا۔ میرے ابا جان کا شراکت کا کاروبار تھا۔ اُن کی وفات کے بعد خدا جانے اُن کے شراکت دار نے کیا چکر چلایا کہ وہ سارے کاروبار کا خود ہی مالک بن گیا اور ہم اپنے حصے سے محروم ہو گئے۔ میری والدہ نے گزر اوقات کے لیے ہمارا بڑا مکان بیچ کر نسبتاً چھوٹا مکان خرید لیا۔ رفتہ رفتہ ساری رقم خرچ ہو گئی۔ میں اس دوران کوئی ڈھنگ کی نوکری بھی تلاش نہ کر سکا، اور جب حالات نے نوکری کرنے پر مجبور کیا تو میٹرک پاس ہونے کی وجہ سے کوئی اچھی نوکری نہ مل سکی۔ میرے پاس کوئی سفارش بھی نہ تھی جو میرے کام آ سکتی۔ ان حالات نے مجھے مزدوری کرنے پر مجبور کر دیا۔ کسی دن مزدوری نہ ملتی تو

ہم دونوں ماں بیٹے فاقہ کشی پر مجبور ہو جاتے۔ یہ ایسے لمحات تھے جن کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے اچھے حالات میں آنکھ کھولی تھی، میں خواب میں بھی ایسے بدترین حالات کا تصور نہیں کرسکتا تھا۔ پچھلے چھ برسوں سے میں ایسے ہی حالات کا شکار ہوں اور آج مجھے تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا ہے۔تم ٹھیک کہتے تھے کہ علم ایک روشنی ہے جو نہ صرف اندر کے اندھیرے دور کرتی ہے بلکہ صحیح راستے کی طرف رہنمائی بھی کرتی ہے۔ میں نے اس سارے عرصے میں بہت مشکل حالات دیکھے ہیں اور اب میں جان گیا ہوں کہ پیسے ہی سے انسان بڑا آدمی نہیں بنتا۔ دولت تو آنی جانی شے ہے لیکن علم ایک ایسی دولت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی اور ہمیشہ رہتی ہے۔ یہ علم کی ہی دولت ہے جو زندگی کے ہر مرحلے میں ہمارے کام آتی ہے۔''

یہ کہہ کر عابد چپ ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ناصر نے اُسے حوصلہ دیا اور عابد کے ساتھ اُس کے گھر جا کر اُس کی والدہ سے بھی ملا اور اُنھیں تسلی دی کہ آپ فکر نہ کریں خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ناصر تدریس کے باعزت پیشے سے وابستہ تو تھا ہی، وہ مالی طور پر بھی قدرے مستحکم ہو چکا تھا۔ لہٰذا اُس نے عابد کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور اُسے شام کے وقت اپنی اکیڈمی میں کلرک کی نوکری دے دی۔ عابد فارغ وقت میں وہ اپنے تعلیمی مراحل طے کرتا رہا۔ آخر ایک دن اپنی محنت سے پرائیوٹ ایم۔ اے کا امتحان پاس کر لیا۔ اب وہ بھی نئی نسل کو اپنے علم کی روشنی سے منور کر رہا تھا۔ اس نے بھی ناصر کے ساتھ مل کر طلبہ کو پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ یوں چراغ سے چراغ جلنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اب عابد کے پاس ہمیشہ رہنے والی دولت آ گئی تھی۔

اُس رزق سے موت اچھّی

طارق لاہوتی ، اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو ، پرواز میں کوتاہی

ہسپتال میں ڈیوٹی پر نئے آنے والے ڈاکٹر عمران کا آج پہلا دن تھا۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر امجد نے اُس پر ایک اُچٹتی نگاہ ڈالی اور خاموشی سے اُس کے سامنے سے گزر گیا۔ ڈاکٹر عمران یورپ سے ہارٹ سرجری کی خصوصی تربیت حاصل کر کے وطن واپس آئے تھے۔ نئے طریقۂ علاج سے اب دل کے بڑے پیچیدہ آپریشن کی بجائے چھوٹے آپریشن سے بھی علاج ہوسکتا تھا۔ اس ہسپتال میں ڈاکٹر عمران سے پہلے ڈاکٹر امجد بھی موجود تھے جو اس نئے طریقۂ علاج سے واقف تھے اور خود بھی ہارٹ سرجری کے لیے مشہور تھے۔

یہ ہسپتال شہر کا بہت بڑا پرائیوٹ ہسپتال تھا۔ اس کے مالک کرنل اختر ریٹائرڈ فوجی تھے اور خاندانی رئیس تھے۔ جدید سہولتوں سے آراستہ یہ ہسپتال کثیر سرمائے سے تعمیر ہوا تھا۔ امراضِ قلب کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس ہسپتال میں یہاں کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر امجد کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ مگر آج ڈاکٹر عمران کی آمد سے وہ کسی قدر پریشان ہو گئے تھے۔

چند روز کے بعد کسی دوسرے شہر سے ایک مریض ہسپتال میں داخل ہوا۔ وہ دل کا

مریض تھا۔ اُس کی بیماری کا واحد علاج یہ تھا کہ اس کے دل کا فوری طور پر آپریشن کیا جائے۔ وہ شخص جس کا نام افضل خان تھا، ایک درمیانی حیثیت کا آدمی تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے قرض لے کر اپنے علاج کے لیے رقم کا بندوبست کیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ہسپتال کے ایک کمرے میں موجود تھا۔ تین ڈاکٹروں کی ٹیم ڈاکٹر امجد کی سربراہی میں کمرے میں داخل ہوئی۔ ان میں ڈاکٹر عمران شامل نہیں تھے۔

''آپ مہربانی فرما کر آپریشن چارجز جمع کروادیں۔'' ڈاکٹر امجد نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر مریض افضل خان نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی جیب سے چیک نکال کر ڈاکٹر امجد کو دیا۔ ڈاکٹر امجد چیک پر لکھی ہوئی رقم پڑھ کر بولا:

''یہ تو ایک لاکھ ساٹھ ہزار کا چیک ہے۔ ہمیں اس آپریشن کے لیے تین لاکھ روپے چاہییں۔ یہ چیک تو آ گیا ہے اب باقی رقم کا بندوبست کرلو، ورنہ آپریشن نہیں ہوگا۔'' افضل خان اور اُس کا بیٹا اکمل پریشان ہوگئے اور اُن کے چہرے پر فکر کے سائے منڈلانے لگے۔

''ڈاکٹر صاحب خدا کے لیے یہ زیادتی نہ کریں ..... میں ..... میں اتنے پیسے کہاں سے لاؤں؟ جب کہ آپ کے اخبار میں دیے گئے اشتہار کے مطابق آپریشن کا خرچ ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے ہے۔'' افضل خان نے کہا۔

''میں کچھ نہیں جانتا..... تمھیں پورے تین لاکھ روپے دینے ہوں گے۔'' ڈاکٹر امجد نے سفاکانہ لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر نکلنے لگا۔ مگر افضل خان نے

اُسے روک لیا اور اپنے بیٹے اکمل کو مخاطب کر کے کہا:

''بیٹا ہم نے گاؤں میں جو زمین کاروبار کی غرض سے بیچی تھی، تم اُس رقم میں سے ایک لاکھ چالیس ہزار روپے کا چیک کاٹ کر مجھے دے دو۔''

بیٹے نے فوری طور پر باپ کے حکم کی تعمیل کی اور چیک پر رقم تحریر کر کے باپ کے حوالے کر دیا۔ افضل خان نے اُس پر دستخط کیے اور پھر دونوں چیک ڈاکٹر امجد کے حوالے کر دیے۔ ڈاکٹر امجد نے تین لاکھ روپے کے دونوں چیک لیے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ ڈاکٹر عمران جو وہاں کچھ دیر پہلے پہنچا تھا اور یہ سارا منظر دروازے کی اوٹ میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹروں کو باہر نکلتا دیکھ کر وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ ڈاکٹر امجد اور اُس کے ساتھی ڈاکٹروں کے جانے کے بعد وہ افضل خان کے کمرے میں داخل ہوا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ باپ بیٹا خاصے پریشان تھے۔

''میں ڈاکٹر عمران ہوں، اس ہسپتال میں نیا آیا ہوں۔ میں نے ڈاکٹر امجد اور اُس کے ساتھیوں کی ساری گفتگو سن لی ہے۔ یہ لوگ انسانیت کے دشمن ہیں اور دوسروں کی مجبوریوں سے کھیل رہے ہیں۔ میں اِنھیں دنیا کے سامنے بے نقاب کر دوں گا تاکہ مسیحا کے روپ میں آنے والے یہ قاتل اپنے انجام کو پہنچ جائیں۔''

ڈاکٹر عمران بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ پھر اُس نے افضل خان سے کہا کہ مہربانی فرما کر آپ دونوں چیک نمبر مجھے لکھ کر دے دیں۔ افضل خان جو خاصا پریشان تھا، ڈاکٹر عمران پر اعتماد کرتے ہوئے بولا:

''بیٹا تم مجھے کوئی نیک اور خدا ترس ڈاکٹر لگتے ہو، مگر دیکھو ہماری وجہ سے کسی

مشکل میں گرفتار نہ ہو جانا ان لوگوں کے ہاتھ بڑے لمبے لگتے ہیں۔تم اِنھیں ان کے حال پر چھوڑ دو، یہ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا۔آپ مجھے چیک نمبر دے دیں۔'' ڈاکٹر عمران نے کہا۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب کم از کم اتنا خیال ضرور رکھیے گا کہ کہیں آپ کے اس اقدام سے ہمیں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔میرے والد کا آپریشن بھی نہ ہو اور رقم بھی ضایع ہو جائے۔'' اکمل خان نے کہا۔

''خُدا نے چاہا تو ایسا نہیں ہوگا۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر عمران افضل خان سے چیک نمبر لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ سارا دن وہ ایک عجیب الجھن میں گرفتار رہا۔وہ سب سے پہلے اس بات کا پتا چلانا چاہتا تھا کہ کیا اس ہسپتال میں ہونے والے گھناؤنے کاروبار میں یہاں کا مالک کرنل اختر بھی شامل ہے یا یہ صرف ڈاکٹر امجد اور اُس کے ساتھیوں کا مکروہ کاروبار ہے .....مگر وہ کوشش کے باوجود اس حقیقت کا پتا نہ چلا سکا۔اس دوران میں افضل خان کا آپریشن بھی ہو چکا تھا اور اُس سے تین لاکھ روپے لے کر ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے کی رسید اُس کے حوالے کر دی گئی تھی۔اس آپریشن میں ڈاکٹر امجد کے ساتھ ڈاکٹر عمران نے بھی حصہ لیا تھا۔ہسپتال سے فارغ ہوتے ہوئے افضل خان اپنا پتا اور رسید کی فوٹو کاپی ڈاکٹر عمران کے حوالے کر گیا تھا۔

اس آپریشن کے چند روز بعد ایک شخص ہسپتال میں داخل ہوا۔ڈاکٹر عمران چھپ چھپ کر ڈاکٹر امجد اور اُس کے ساتھیوں کی باتیں سن رہا تھا، اُسے سنہری موقع

مل ہی گیا۔ ڈاکٹر امجد اپنے جونیر ڈاکٹر فاروق سے کہہ رہا تھا:

''یہ ہسپتال کا مالک کرنل اختر بھی عجیب آدمی ہے۔ جب بھی کسی غریب بیمار آدمی کو دیکھتا ہے، مفت علاج کے لیے ہمارے پاس بھیج دیتا ہے۔ خیر ہمارا کیا جاتا ہے۔ اس مریض کے دل کا والو بند ہے۔ چھوٹا سا آپریشن کر دیں گے۔ اس کے دونوں گردے ٹھیک ہیں۔ لہٰذا اس مریض کا ایک گردہ نکالنے کے بعد صفدر کو بھیج دینا اور اس مرتبہ زیادہ رقم لینا اور ہاں ڈاکٹر عمران کو اس آپریشن میں شامل نہ کرنا۔ مجھے اُس کے تیور ٹھیک نہیں دکھائی دیتے۔ ہمیں اب مکمل رازداری اور احتیاط سے اپنا تمام کام کرنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر امجد چپ ہو گیا۔ اب ڈاکٹر عمران کے علم میں یہ بات آ چکی تھی کہ ہسپتال میں ہونے والی غیر انسانی اور مکروہ سرگرمیوں سے کرنل اختر ناواقف ہیں۔ لہٰذا اُس نے خاموشی سے کرنل اختر کا پتا معلوم کیا اور اُن کے گھر پہنچ گیا۔ مگر وہاں جا کر اُسے نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ کرنل اختر شام کی فلائٹ سے بیس دن کے لیے یورپ جا رہے ہیں اور اس وقت کچھ ضروری خریداری کے لیے اپنے اہل خانہ کے ساتھ گھر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر عمران کے لیے یہ لمحے انتہائی کربناک تھے۔ وہ ذہنی طور پر ایک عذاب کی کیفیت سے گذر رہا تھا۔ اُس کی تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں اُس کے والدین نے ہر قدم پر اُسے ایمان و کردار کی حفاظت کرنے اور رزقِ حلال کمانے کا سبق دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر عمران زندگی کے کسی معاملے میں ایمان پر سمجھوتا نہیں کرتا تھا۔ یہ اُس کے ایمان کی طاقت تھی جو اُسے برائی کو بے نقاب کرنے کے لیے بے چین کر رہی تھی۔ ڈاکٹر عمران نے کرنل اختر کا انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا اور ساری صورتِ حال ایک خط

میں لکھ کر وہ خط نوکر کے حوالے کر دیا۔ اس خط میں ہسپتال میں ہونے والی غیر قانونی سرگرمیوں کا پورا ذکر موجود تھا۔ ڈاکٹر عمران نے افضل خان کے علاج کے لیے اور نئے آنے والے مریض کے گردہ نکالنے کی پوری کہانی کے ساتھ ساتھ اپنا استعفا بھی خط کے ساتھ رکھ دیا تھا اور لکھ دیا تھا کہ وہ ایسے بُرے اور غلیظ ماحول میں مزید ملازمت نہیں کرسکتا۔ اُس نے خط کی چار فوٹو کاپیاں بھی کروالی تھی جو اُس نے ڈی ایس پی سٹی، علاقے کے پولیس اسٹیشن، کمشنر آفس اور آرمی مانیٹرنگ سیل میں پوسٹ کر دی تھیں۔ یہ سارے کام کر کے جب وہ اپنے گھر لوٹا تو خاصا مطمئن تھا۔ مگر اب بھی اس کے اندر ایک بے چینی سی تھی کہ کسی طرح مجرم اپنے انجام کو پہنچ جائیں۔

اُسے زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک دن صبح کے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر عمران نے دروازہ کھولا تو وہاں پولیس کے چند سپاہی کھڑے تھے۔ ایک سپاہی بولا:

''اگر آپ ڈاکٹر عمران ہیں تو کرنل اختر صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔'' ڈاکٹر عمران تیار ہو کر اُن کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ پولیس کی گاڑی تقریباً بیس منٹ کے بعد تھانے کے پاس جا کر رُکی۔ ڈاکٹر عمران اندر داخل ہوئے تو وہاں کرنل اختر پہلے سے موجود تھے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اُنھوں نے ڈاکٹر عمران کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر گلے سے لگا لیا اور بولے: ''تم جیسا ایمان دار اور بہادر شخص پوری قوم کے لیے قابل فخر ہے۔ میں تمھاری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ میں حیران ہوں کہ میرے ہسپتال میں بدعنوانیاں ہوتی رہیں اور میں

ان سب حقائق سے بے خبر رہا۔ تمھیں مبارک ہو کہ تمھاری بروقت کارروائی سے ڈاکٹر امجد اور اس کے ساتھی ڈاکٹرز اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔"

"لیکن..... لیکن یہ سب کیسے ممکن ہوا۔" ڈاکٹر عمران نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات میں کہا۔ کرنل اختر نے کہا: "جس دن مجھے تمھارا خط ملا، خط پڑھ کر میں بڑی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ میں ڈاکٹر امجد کو قابلِ اعتماد آدمی سمجھتا تھا، مگر مجھے تمھاری قابلیت اور ایمان داری پر بھی کوئی شبہ نہ تھا۔ میں ملک سے باہر جا رہا تھا لیکن پھر باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں اپنے دوست ریٹائرڈ بریگیڈیر توصیف خان کے پاس گیا۔ جس نے مجھے ایک ڈراما کرنے کا مشورہ دیا۔ پروگرام کے مطابق توصیف خان کو ایک غریب مریض بنا کر ہسپتال میں بھیج دیا۔ ڈاکٹر امجد اور اس کے ساتھی چوری چھپے توصیف کا آپریشن کرنے اور گردہ نکالنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے کہ توصیف نے مجھے تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ میں نے پولیس کو فون کر دیا اور تم تو پہلے ہی میرے نام لکھے گئے خط کی کاپیاں مختلف جگہوں پر بھیج چکے تھے۔ لہٰذا یہ سارا کام تین دنوں میں ہو گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو تمھارے ہسپتال نہ آنے پر بھی کوئی شک نہ ہوا۔" یہ کہہ کر کرنل اختر خاموش ہو گئے۔ پولیس انسپکٹر ڈاکٹر عمران کو حوالات کی طرف لے گئے، جہاں ڈاکٹر امجد اور اُس کے ساتھی قید تھے۔ ڈاکٹر عمران نے دیکھا کہ اُن کے سر شرم سے جھکے ہوئے تھے۔

کرنل اختر نے ڈاکٹر عمران کا استعفا قبول نہیں کیا، بلکہ اُنھیں ترقی دے کر میڈیکل سپرنٹنڈنٹ مقرر کر کے تنخواہ بھی دگنی کر دی۔ ڈاکٹر عمران اب مطمئن تھے۔ اُن کے ضمیر پر سے ایک بڑا بوجھ اتر چکا تھا۔ ان کے ذہن میں اقبال کا یہ شعر گونج رہا تھا۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خُدا کے بندوں سے پیار ہوگا

آج انور خوش خوش گھر جا رہا تھا وہ ایک کارخانے میں ملازم تھا جہاں اُسے مہینے کی بجائے ہفتہ وار تنخواہ ملتی تھی۔ آج وہ اپنے ہفتہ بھر کی کمائی اپنی والدہ کے ہاتھوں پر رکھ کر اُن کی دعائیں لینے کے لیے بے چین تھا۔ اِسی لیے آج اُس کے قدم بہت تیزی سے گھر کی جانب اُٹھ رہے تھے۔

ساجدہ بیگم ایک بیوہ خاتون تھیں اور انور اُن کی اکلوتی اولاد تھا۔ آج سے چند برس قبل انور کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ ساجدہ بیگم محنت مزدوری اور سلائی کڑھائی کر کے گذر اوقات کرتی رہیں۔ اس دوران انور نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔ انور کو ایک فیکٹری میں ملازمت مل گئی مگر ساجدہ بیگم بیمار رہنے لگیں۔ اُن کے لیے کام کرنا کافی مشکل ہوگیا تھا۔ انور ہر ہفتے پانچ سو روپے لا کر اپنی والدہ کے ہاتھ پر رکھ دیتا اور وہ اپنی دوائی سے لے کر گھر کے اخراجات تک سارا حساب ترتیب دے لیتی تھیں۔ یوں دونوں ماں بیٹا رُوکھی سوکھی کھا کر ہنسی خوشی گزر بسر کر رہے تھے۔

انور نے سڑک پر کار کے بریک چرچرانے کی آواز سُنی۔ اُس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکا کار کے نیچے آ گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک خون سے بھر گئی تھی۔

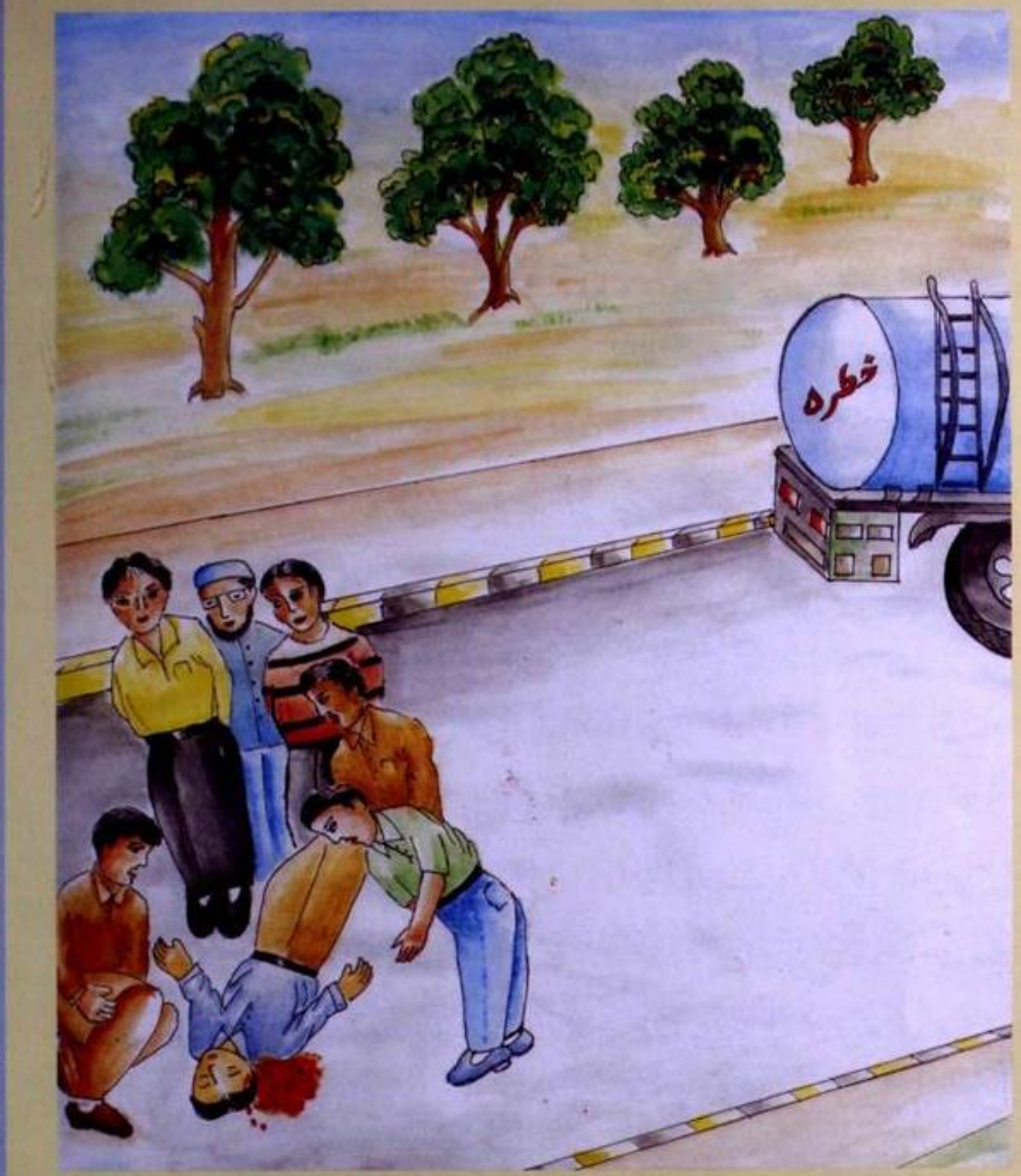

سب لوگ پولیس کے خوف سے لڑکے کے قریب جانے سے گریز کر رہے تھے کہ کہیں اس حادثے کے کیس میں خود بھی نہ پھنس جائیں۔ انور نے دیکھا کہ نوجوان لڑکے کی

زندگی خطرے میں ہے، لہٰذا اُس نے جلدی سے ایک ٹیکسی رُکوائی اور لڑکے کو اُس میں ڈال کر ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ لڑکے کا کافی خون ضایع ہو چکا ہے اور اُسے خون کی اشد ضرورت ہے۔ انور نے اپنے خون کا گروپ چیک کروایا تو اتفاق سے وہی گروپ تھا جو اُس لڑکے کا تھا۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر انور کا خون لے کر اُس کی جان بچالی لیکن اُسے ٹیکسی کا کرایہ اور ہسپتال کا بل جو تقریباً ڈھائی سو روپے بنتا تھا، اپنی جیب سے ادا کرنا پڑا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ ایک سرکاری ہسپتال تھا۔ ورنہ پرائیوٹ ہسپتال میں اخراجات بڑھ سکتے تھے۔ رقم ادا کرنے کے بعد اُس نے بے ہوش نوجوان کو وہیں چھوڑا اور ڈاکٹر کو اپنا نام اور پتا نوٹ کروا کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

انور جب اپنے گھر پہنچا تو ماں اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔ کیوں کہ اُسے ماں کی دوائیں اور گھر کا سامان لانا تھا۔ گھر پہنچ کر اُس نے اپنی ماں کو یہ سارا واقعہ سنایا۔ ساجدہ بیگم بہت نیک عورت تھیں۔ کہنے لگیں:

''بیٹا مجھے تم پر فخر ہے۔ تمھارے اس اچھے عمل پر مجھے دلی خوشی ہوئی ہے۔ اس ہفتے میری دوائی رہنے دینا ہم کم پیسوں میں ایک وقت کا کھانا کھا کر بھی گزارا کر لیں گے۔ ہمارے رسولؐ اللہ کا فرمان ہے کہ جس نے ایک شخص کی جان بچائی اُس نے پوری انسانیت کی جان بچائی۔ خدا تمھیں اپنی اَمان میں رکھے اور نیکی کرنے کا جذبہ ہمیشہ تمھارے اندر پروان چڑھتا رہے۔ ماں کی یہ حوصلہ افزا باتیں سن کر انور کو پہلے سے کہیں زیادہ دلی اطمینان ہوا۔ اُس نے باقی رقم سے ماں کو دو دن کی دوائی اور

چند دن کا ضروری سامان لا کر دے دیا لیکن تین دن بعد گھر میں فاقے کی نوبت آ گئی اور ہفتے کے باقی دن انتہائی تنگی میں گزرے۔

کچھ دنوں کے بعد شام کو جب انور کارخانے سے گھر واپس آیا تو اُس کی ماں نے بتایا کہ کوئی نوجوان لڑکا اُس سے ملنے آیا ہوا ہے اور وہ کمرے میں بیٹھا اُس کا انتظار کر رہا ہے۔ انور کمرے میں داخل ہوا تو ایک شناسا چہرہ اُس کا منتظر تھا۔ انور نے اُسے سلام کیا۔ یہ وہی نوجوان تھا جسے انور نے خون دے کر اس کی جان بچائی تھی۔

''انور بھائی آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ مجھے پہچان تو گئے ہوں گے میرا نام عزیز ہے۔ میں اب خدا کے فضل و کرم اور آپ کی مہربانی سے ٹھیک ہوں۔ ہسپتال سے میں نے آپ کا نام اور پتا لے لیا تھا۔ لہٰذا میں ڈھونڈتا ہوا آپ تک پہنچ گیا ہوں۔ اُس دن اگر آپ نہ ہوتے تو نہ جانے میری کیا حالت ہوتی۔'' نوجوان جس نے اپنا نام عزیز بتایا تھا بولتا ہی جا رہا تھا۔

انور نے عزیز کی باتیں سنیں اور بولا:

''بھائی میں نے تو اپنا فرض پورا کیا ہے۔ جان بچانے والی تو خدائے پاک کی ذات ہے۔ قدرت کو تمھاری زندگی منظور تھی۔ میں نہ ہوتا تو کسی سبب سے وہاں کوئی اور آ جاتا۔''

آپ بہت اچھے اور نیک انسان ہیں۔ میں آپ کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔'' عزیز نے کہا۔

اس کے بعد کچھ دیر تک دونوں گفتگو کرتے رہے۔ عزیز نے انور کو بتایا کہ اُس

کے والد کی گارمنٹس فیکٹری ہے اور اگر وہ چاہے تو اُسے وہاں بہتر ملازمت مل سکتی ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک کارڈ انور کے حوالے کر دیا۔ جاتے ہوئے ایک ہزار روپے بھی انور کو دینے لگا۔ رقم دیکھ کر انور بولا:

''عزیز بھائی میں نے تمھاری مدد خوفِ خدا اور ہمدردی کے جذبے کے تحت کی تھی میں اپنی نیکی چند روپوں کے عوض نہیں بیچ سکتا۔''

''لیکن میرے علاج پر تمھارے پیسے خرچ ہوئے ہیں۔'' عزیز بولا۔

لیکن انور نے یہ کہہ کر رقم لوٹا دی کہ علاج پر خرچ ہونے والی معمولی رقم دے کر اُسے شرمندہ نہ کیا جائے۔ عزیز اپنے محسن انور کے اس جذبے سے اور زیادہ متاثر ہوا۔ انور کے گھر کی حالت اور ماں بیٹے کے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان

کے مالی حالات بہت خراب ہیں مگر اس کے باوجود انور نے رقم واپس کر دی تھی۔ عزیز نے انور پر زور دیتے ہوئے کہا کہ وہ یہ رقم بطور اُدھار رکھ لے اور کل شام فیکٹری میں آ کر اس کے والد نذیر احمد سے ملے۔ وہاں وہ خود بھی موجود ہوگا اور اُسے مناسب نوکری ضرور مل جائے گی۔ یہ کہہ کر عزیز نے وہاں سے جانے کی اجازت چاہی اور ایک نظر اپنے محسن کی طرف دیکھ کر کہا:

''میں جان چکا ہوں کہ آپ بڑے خوددار آدمی ہیں مگر کل فیکٹری ضرور آیئے گا۔ مجھے دلی مسّرت ہوگی۔ اگر آپ نہ آئے تو میں بے چین رہوں گا اور پھر مجھے خود آنا پڑے گا۔'' انور نے عزیز کی طرف مسکرا کر دیکھا اور ہزار روپے کی رقم بطور اُدھار رکھ کر دوسرے دن فیکٹری آنے کا وعدہ کر لیا۔

اگلے دن انور عزیز کے والد نذیر صاحب سے ملا۔ اُس وقت وہاں عزیز بھی موجود تھا۔ عزیز کے والد نے ایک مختصر انٹرویو کے بعد انور کو فیکٹری میں ملازمت دے دی۔ یہاں اُس کی تنخواہ بھی بہتر تھی اور دیگر سہولیات بھی میسر تھیں۔ انور کے حالات دن بہ دن بہتر ہونے لگے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انور کے اندر نیکی کرنے اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ پختہ ہوتا چلا گیا۔ وہ ہر لمحے خدا کا شکر گذار رہنے لگا اور اُس کی ماں کی طبیعت بھی بہتر علاج سے ٹھیک ہوگئی۔ انور نے مزید آگے پڑھنے کے لیے پرائیوٹ طور پر مزید تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یوں اُس کا مستقبل روشن ہوتا چلا گیا۔

شہید

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

سلیم ایک محنتی طالب علم تھا۔ وہ اپنی بیوہ ماں کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتا تھا جو سرحدی علاقے کے قریب واقع تھا۔ سلیم کا باپ فوج میں کیپٹن تھا اور ایک جنگ میں بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو چکا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب سلیم کی عمر تین سال تھی اور اُس کا چھوٹا بھائی نعیم بہ مشکل دو مہینے کا تھا۔ سلیم کی ماں نے اپنے دونوں بچوں کو محنت مزدوری کر کے پالا تھا اور سخت مشکل حالات میں بھی انھیں تعلیم دلوائی تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد ملنے والی پینشن پر اُن کا مشکل سے گزارا ہو رہا تھا۔

سلیم نویں اور نعیم چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ سلیم کے اندر اپنے باپ کی طرح جذبۂ حُب الوطنی کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا اور اُس کا ارادہ بڑے ہو کر فوجی افسر بننے کا تھا۔ وہ اکثر اپنی ماں سے اپنے شہید والد کے متعلق پوچھتا۔ وہ اُن کی فوجی زندگی کے کارنامے سُن کر بہت متاثر ہوتا۔ سلیم خوابوں میں خود کو ایک فوجی کے روپ میں سرحدوں کا دفاع کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ اس کے دل میں برابر یہ آرزو پل رہی تھی کہ وہ بھی اپنے ابو کی طرح کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے اور شہادت کا رتبہ حاصل کرے۔

ایک دن دونوں بھائی اسکول سے واپس آ رہے تھے کہ تیز سائرن کی آواز سنائی دی اور اُس کے ساتھ ہی لاؤڈ اسپیکر پر یہ اعلان ہوا کہ دُشمن ملک کی فوج نے ہم پر حملہ کر دیا ہے اور سرحدی علاقہ خاص طور پر خطرے میں ہے۔ لہٰذا جتنی جلدی ممکن ہو سکے اپنے اپنے گھروں میں یا جہاں کہیں بھی پناہ ملے چھپ جائیں۔ یہ اعلان سُنتے ہی سلیم اور نعیم دوڑتے ہوئے قریب ہی اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ ماں اُن کی اس تیز رفتاری سے اندر داخل ہونے کا سبب پوچھتیں، دروازے پر دستک ہوئی۔ سلیم نے دروازے کے سوراخ سے جھانک کر باہر دیکھا تو وہاں فوج کے چند سپاہی کھڑے تھے۔

سلیم نے دروازہ کھول دیا۔ ایک فوجی اُس سے مخاطب ہو کر بولا:

''بیٹا دشمن ملک کی فوج نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ لہٰذا فوجی جوانوں کے ساتھ ساتھ آپ سب کو بھی اپنی حفاظت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہم آپ کو اسلحہ دینے آئے ہیں تا کہ کسی خطرے کے پیش نظر آپ دُشمن سے مقابلہ کر سکیں۔ آپ ذرا اپنے والد صاحب کو بلائیں۔'' یہ کہہ کر فوجی نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بھاری بیگ سے ایک بندوق، ریوالور، گولیاں اور چند دستی بم نکال لیے۔ سلیم بولا:

''میرے والد صاحب بھی ایک فوجی تھے جو برسوں پہلے ملک کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہو چکے ہیں۔ آپ یہ اسلحہ مجھے دے دیں اور اگر ہو سکے تو مجھے بھی سرحد پر اپنے ساتھ لے چلیں تا کہ میں بھی دشمن کے خلاف جنگ میں آپ کا ساتھ دوں اور اپنے شہید والد کے مشن کو جاری رکھ سکوں۔''

سلیم کا یہ جذبہ دیکھ فوجی بہت متاثر ہوئے اُن میں سے ایک بولا:

''بیٹا تم ابھی چھوٹے ہو، اس لیے ہم تمھیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ وقت آنے پر تمھیں ضرور موقع ملے گا۔ فی الحال یہ اسلحہ اپنے پاس رکھ لو۔ کل یہاں چند فوجی آئیں گے اور دُوسرے لوگوں کے ساتھ تمھیں بھی اسلحے کا استعمال سکھا دیں گے۔ تا کہ ضرورت پڑنے پر تم اپنی حفاظت کر سکو۔'' اتنا کہنے کے بعد فوجی وہاں سے چلے گئے اور سلیم اُداس ہو کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ سارا دن اور ساری رات فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

اگلے دن جنگ کی وجہ سے تمام تعلیمی ادارے بند ہو چکے تھے۔ شام کو جب دو فوجی اُنھیں اسلحہ کا استعمال سکھانے آئے تو سلیم ضد کر کے اُن کے ساتھ ہی چل پڑا۔

فوجی کیمپ اُن کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس وقت کیمپ میں کچھ افسر موجود تھے۔ چند فرلانگ کے فاصلے پر ہی دشمن فوجیوں کا اُن کے ملک کے جوانوں سے گولہ بارود اور فائرنگ کا مسلسل تبادلہ ہو رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر سلیم نے کہا کہ اُسے یہاں رہ کر زخمی فوجیوں کی خدمت کرنے کی اجازت دی جائے۔ سلیم کی اس خواہش پر فوجی اُسے یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر عظیم خان کے پاس لے گئے۔ عظیم خان درمیانی عمر، مضبوط جسم اور پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ اُنھوں نے جب ایک بچے کی یہ عجیب وغریب خواہش سنی تو پہلے اُسے وہاں رکھنے پر راضی نہ ہوئے لیکن بعد میں سلیم کے بے حد اصرار اور اس شرط پر کہ سلیم اپنی ماں سے باقاعدہ اجازت بھی حاصل کرے گا، عظیم خان نے اُسے کیمپ میں رہنے کی اجازت دے دی۔ سلیم گھر واپس آ گیا۔ اُس نے اپنی ماں سے کیمپ میں جانے کی اجازت مانگی اور اپنا مختصر سا سامان باندھ کر محاذِ جنگ کے قریب واقع کیمپ میں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ ماں نے نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ اُسے رخصت کیا اور آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ بہنے دیا۔

فوجی کیمپ میں پہنچ کر سلیم نے جنگ میں زخمی یا بیمار ہونے والے فوجیوں کی خدمت شروع کر دی۔ وہ نہ صرف اُن کی مرہم پٹی میں ڈاکٹروں کے ہمراہ ہوتا بلکہ کھانا کھلانے میں بھی دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مدد کرتا تھا۔ اس کے علاوہ سلیم نے فوجی تربیت بھی حاصل کرنا شروع کر دی تھی۔ کمانڈنگ آفیسر عظیم خان، سلیم کی بہادری سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

ایک دن سلیم کیمپ میں کسی زخمی سپاہی کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ اس وقت عظیم خان

بھی وہاں زخمیوں کی عیادت کرنے آئے ہوئے تھے۔ ایک فوجی کمرے میں داخل ہوا اور عظیم خان کو سیلوٹ مارتے ہوئے بولا:

''سر خطرہ بہت بڑھ گیا ہے۔ دُشمن کا فوجی دستہ باؤنڈری لائن پار کر کے ہمارے علاقے میں داخل ہونے والا ہے۔ ہمیں فوری طور پر بڑے پل کو تباہ کرنا پڑے گا اور اس کے لیے ہمیں کافی آگے جانا ہوگا۔ ورنہ اس پل کے ذریعے دشمن ہماری سرحد میں داخل ہو جائے گا۔ سر آپ کا کیا حکم ہے۔'' یہ کہہ کر فوجی تو خاموش ہو گیا لیکن عظیم خان گہری سوچ میں مبتلا ہو گئے۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا اور انھیں فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ لہٰذا کچھ توقف کے بعد بولے:

''تین چار آدمی مل کر جاؤ اور پوری طاقت سے دستی بم پھینک کر واپس پلٹنے کی کوشش کرو۔ لیکن دیکھو آگے کوئی ایسا آدمی بڑھے جو دُبلا پتلا ہو اور اس طرح چھپتا ہوا جائے کہ دُشمن کی نظروں سے اوجھل رہے۔ خدا بہتر حفاظت کرنے والا ہے۔ بس اب جلدی جاؤ۔'' عظیم خان کا یہ حکم سُن کر فوجی جوں ہی وہاں سے جانے لگا، سلیم نے اُسے وہیں روک لیا اور عظیم خان سے مخاطب ہو کر بولا۔

''سر میں بہت دبلا پتلا لڑکا ہوں۔ آپ مجھے آگے بھیج دیں۔ خدا نے چاہا تو دشمنوں کو نیست و نابود کر کے آؤں گا۔'' عظیم خان نے سلیم کی یہ باتیں سن کر بولے:

''بیٹا یہ ممکن نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی تمھاری عمر کم ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ تم باقاعدہ فوجی نہیں ہو۔ میں تمھاری زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتا۔'' لیکن سلیم کا اصرار اس قدر بڑھا کہ عظیم خان کے لیے بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

انھوں نے سلیم کو اجازت دے دی۔

اس کے بعد عظیم خان نے وائرلیس پر پل سے کچھ فاصلے پر موجود اپنی فوج کے دستے کے سربراہ کیپٹن شہباز سے اپنے مشن کے بارے میں گفتگو کی اور بے چینی سے کسی اچھی خبر کا انتظار کرنے لگے۔

دوسری طرف سلیم تین فوجیوں کے ساتھ کیپٹن شہباز کے فوجی دستے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ یہاں سے اُنھیں رینگتے ہوئے پل کے قریب پہنچنا تھا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے دستی بموں سے پل کو اُڑانے کی کوشش کرنی تھی۔ یہ انتہائی خطرناک مشن تھا۔ ذرا سی لاپروائی سے سلیم اور اُس کے تین ساتھیوں کی جان بھی جا سکتی تھی۔ سلیم اپنے دونوں ہاتھوں میں دستی بم لے کر رینگتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ حب الوطنی کے جذبے سے لیس تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اُس کے اندر ایمان کی ایک ایسی قوّت ہے جس نے اُسے موت کے خوف سے دور کر دیا ہے۔ لہٰذا اُس نے فوری ایک فیصلہ کیا۔ وہ تیزی سے لڑھکتا ہوا پُل کے نچلے حصّے میں پہنچ گیا۔ دُشمن کے سپاہی جو اس وقت پل پر موجود تھے، کسی چیز کے گرنے کی آواز سن کر چوکنا ہو گئے۔ انھوں نے فائرنگ شروع کر دی، لیکن اس وقت تک سلیم پل کے نیچے لوہے کے گارڈروں میں تین بم رکھ چکا تھا اور اُن کی پنیں نکال چکا تھا۔ اگلے چند لمحوں میں ایک زبردست دھماکا ہوا اور پل سمیت دشمن فوجیوں کی بڑی تعداد کے پرخچے اُڑ گئے۔

سلیم کا جسم بھی فضا میں تحلیل ہو چکا تھا۔ وہ شہادت کے عظیم رتبے پر فائز ہو چکا تھا۔ اِس ننھے مجاہد نے ملک کی عزت اور وقار کو بچا لیا تھا۔ پل کی تباہی کے بعد دشمن کی

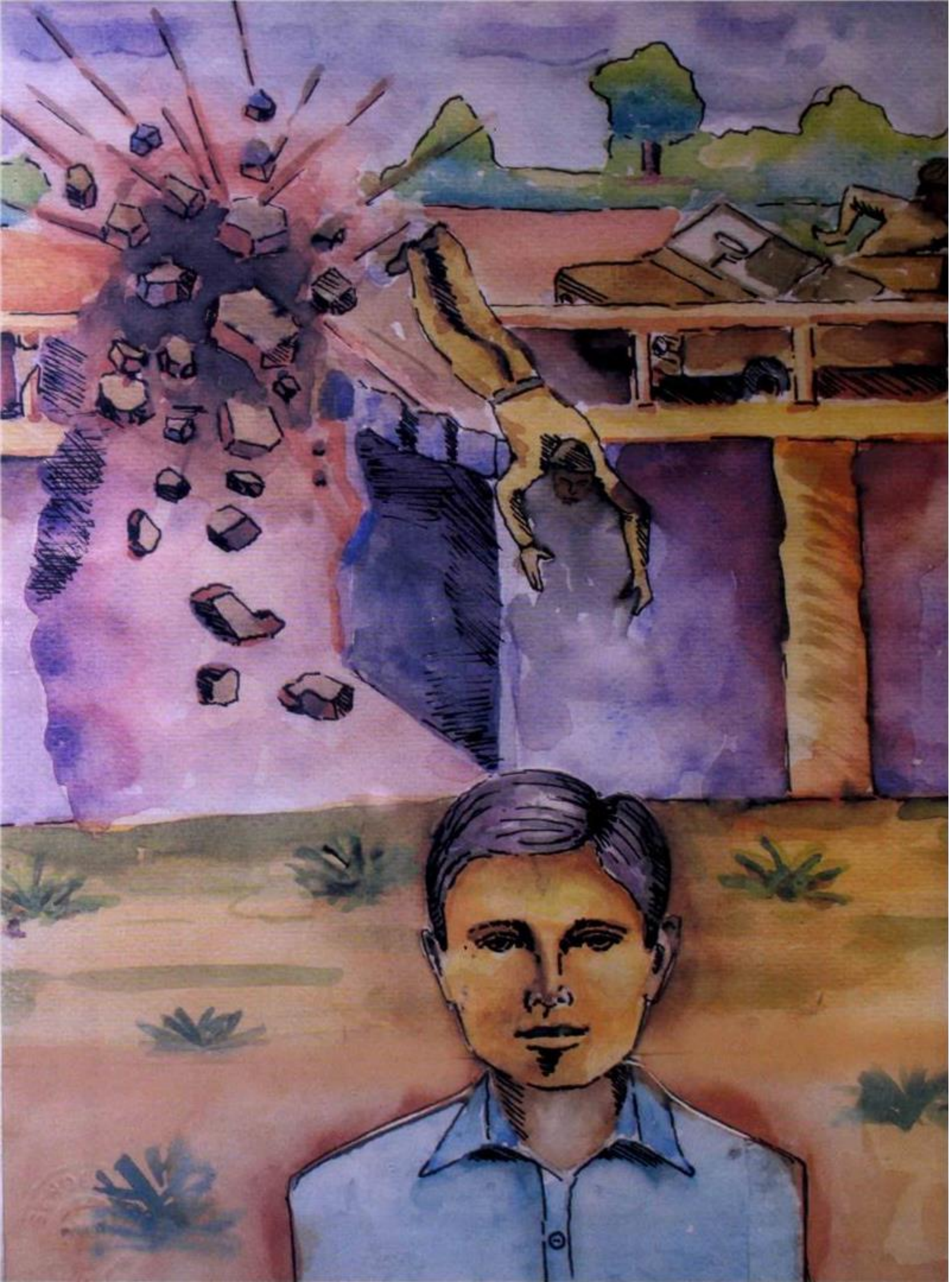

فوج بھی پسپائی پر مجبور ہوگئی۔ جب عظیم خان کو سلیم کے کارنامے اور شہادت کی خبر ملی تو وہ اس ننھے جان نثار کی بہادری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے اور وہ خود فوج کے چند جوانوں کے ساتھ سلیم کی ماں کو اُس کی شہادت کی خبر دینے روانہ ہوگئے۔ ماں نے بیٹے کی شہادت کی خبر سُنی تو ایک لمحے کے لیے سکتے میں آ گئیں لیکن پھر وہ اپنے دل کو مضبوط کر کے بولیں:

''میں اپنے وطن کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنے پر اپنے شوہر اور بیٹے کی عظمت کو سلام کرتی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے میرا چھوٹا بیٹا نعیم بھی فوج میں جائے گا۔''

سلیم کی ماں کی زبان سے یہ الفاظ سن کر عظیم خان سمیت سب کی آنکھیں اشک بار تھیں۔

مقدر کا ستارہ

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے مِلّت کے مقدر کا ستارہ

ڈاکٹر اسفند یار اور ڈاکٹر فیصل دونوں بچپن سے بڑے گہرے دوست تھے۔ دونوں ایک ساتھ پروان چڑھے تھے۔ اپنے وطن میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد چند جدید کورسز کے لیے دونوں ملک سے باہر گئے تھے اور کچھ عرصہ قبل ہی یورپ سے بچوں کے مخصوص امراض میں خصوصی تعلیم حاصل کر کے واپس آئے تھے۔ وہ شہر کے دو مختلف ہسپتالوں میں الگ الگ ملازمت کر رہے تھے۔ ڈاکٹر فیصل ناک، کان اور گلے کی بیماریوں کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ نوزائیدہ بچوں کے علاج میں بھی خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ جب کہ ڈاکٹر اسفند یار ہڈیوں کے امراض کے ماہر سرجن اور پولیو سے متاثرہ بچوں کے امراض کے جدید اور کامیاب آپریشن میں مہارت رکھتے تھے۔

دونوں دوستوں کو اپنے وطن میں ملازمت کرتے ہوئے ابھی چند مہینے ہی ہوئے تھے، لیکن اپنے وطن کے نظام میں موجود خرابیوں پر وہ اکثر بہت کڑھتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر فیصل نے تو کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو اس ماحول کا عادی بنا لیا تھا۔ مگر ڈاکٹر اسفند یار کی حساس طبیعت اُنھیں اندر ہی اندر اپنے ملک کے ماحول سے

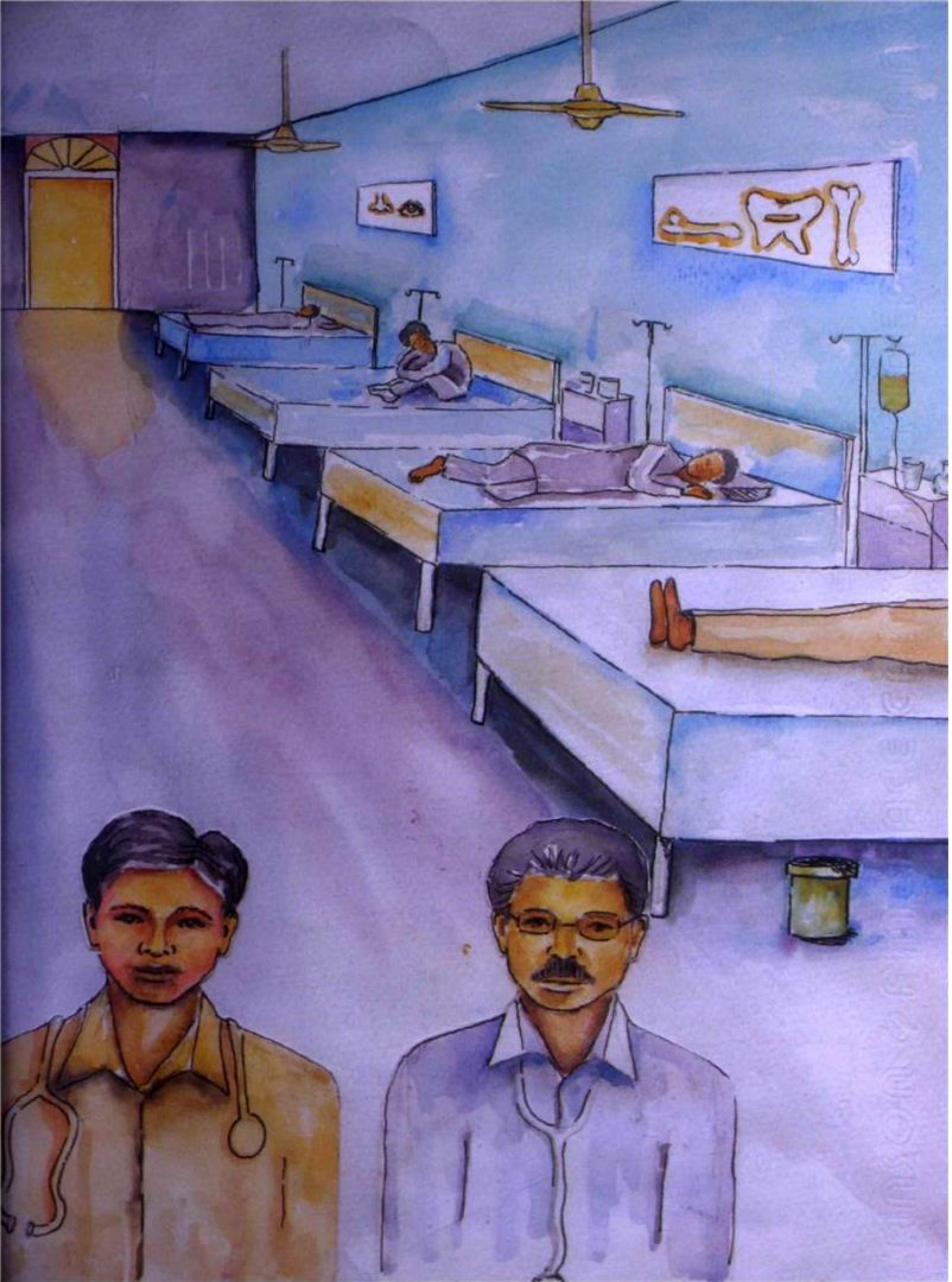

بیزار کر رہی تھی۔ وہ اکثر ڈاکٹر فیصل سے اس بات کا ذکر کرتے کہ میں ان حالات میں زیادہ دیر تک ملازمت جاری نہیں رکھ سکتا اور بہت جلد یہ ملک چھوڑ جاؤں گا۔ ڈاکٹر فیصل یہ باتیں سُن کر ڈاکٹر اسفندیار کو سمجھاتے کہ اُنھیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے نظام میں بہت سی خرابیاں ہیں جس کی وجہ سے ایک فرض شناس، ایمان دار اور با اُصول آدمی کے لیے یہاں کام کرنا مشکل ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اس صورتِ حال سے دل برداشتہ ہو کر ملک ہی چھوڑ دے۔ اگر ہمارے ملک کے ہُنر مند، ماہر اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل افراد اسی طرح بیرون ملک جاتے رہے تو ہمارا ملک تو خالی ہو جائے گا۔ اور ایسے مسائل کا شکار ہو جائے گا کہ جن کا حل دشوار ہوگا۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ یہیں رہ کر ان مسائل اور خرابیوں کو دور کریں۔ آپ معذور بچوں کا کامیاب علاج کر کے نہ صرف اُن کی محرومی دور کر رہے ہیں بلکہ انھیں مستقبل کی سہانی امید بھی دلا رہے ہیں۔ میں نے یہ جذبہ بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے جس کا صلہ دُنیا و آخرت دونوں میں ملے گا۔ ڈاکٹر فیصل کی اس طویل اور حوصلہ افزا گفتگو کے باوجود ڈاکٹر اسفندیار مطمئن نہ ہوئے۔

ایک دن ڈاکٹر فیصل اپنے بیٹے کی سال گرہ کی دعوت دینے کے لیے ڈاکٹر اسفندیار کے گھر گئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ اُداس اور بجھے بجھے سے ہیں۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد ڈاکٹر فیصل نے اپنے دوست سے اُداسی کا سبب پوچھا۔ ڈاکٹر اسفندیار کے چہرے پر کچھ ناگواری کے تاثرات اُبھرے پھر کچھ توقف کے بعد بولے:

"فیصل! آپ کو تو پتا ہے کہ مجھے روزانہ چار پانچ بچوں کے آپریشن کرنے

ہوتے ہیں ۔ کیوں کہ ہمارے شعبے میں مریضوں کی تعداد باقی شعبوں سے زیادہ ہے ۔ آج کل پولیو کے خاتمے کے لیے چلائی جانے والی مہم کے باوجود ملک میں بہت سے متاثرہ بچے موجود ہیں جن کا کئی دوسرے ہسپتالوں کے ساتھ ساتھ ہمارے ہسپتال میں بھی علاج ہو رہا ہے ۔ ہمارے ہسپتال میں چند ڈاکٹروں نے اپنی اجارہ داری قائم کی ہوئی ہے ۔ اکثر اوقات میرے آپریشن کا وقت تبدیل کر دیا جاتا ہے اور جب میں تبدیل شدہ وقت کے مطابق آپریشن تھیٹر جاتا ہوں تو اس وقت وہاں کوئی اور ڈاکٹر اپنے مریض کے ساتھ آپریشن میں مصروف ہوتا ہے ۔ اس وقت مجھے شدید اُلجھن اور ذہنی تکلیف ہوتی ہے ۔ اس طرح میرا وقت بھی ضایع ہوتا ہے اور مریض کے لواحقین بھی متاثر ہوتے ہیں اور ان پر مایوسی طاری ہو جاتی ہے ۔ انھیں اس حال میں دیکھ کر مجھے اس قدر اذیت ہوتی ہے کہ میں خود کو مجرم سمجھنے لگتا ہوں ۔ ایسا اس لیے ہے کہ چند ڈاکٹر میری بڑھتی ہوئی شہرت کی وجہ سے پیشہ ورانہ رقابت کا مظاہرہ کر رہے ہیں ۔ میں نے کئی مرتبہ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے شکایت بھی کی ہے لیکن وہ یہ کہہ کر مجھے خاموش کرا دیتے ہیں کہ خود کو اس نظام کا حِصہ بنانے کی کوشش کرو ۔ پرسوں جب میں دوبارہ اُن کے پاس اپنی شکایت لے کر پہنچا تو وہاں موجود ڈاکٹر فرید نے مجھے کہا کہ آپ کو اپنے سینیر ڈاکٹر کا احترام کرتے ہوئے ان سے پوچھ کر شیڈول بنانا چاہیے اور اگر کسی دن کوئی آپریشن رہ جائے تو اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے ۔ مجھے اُن کی یہ بات سُن کر بڑی مایوسی ہوئی ۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ اس وقت بھی خاموش تھے اس لیے میں نے بھی ڈاکٹر فرید کو کوئی جواب نہیں دیا ۔''

''یہ تو واقعی بڑی تشویش کی بات ہے۔ تمھیں چیرمین صاحب اور سینیر میڈیکل سپرنٹنڈنٹ صاحب سے بات کرنی چاہیے۔ کیوں کہ اُنھوں نے ہی تمھیں ملازمت کی پیش کش کی تھی اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تمھارا تبادل ملنا آسان نہیں۔'' ڈاکٹر فیصل نے اپنے دوست کی طویل گفتگو سننے کے بعد کہا۔

''چھوڑیں جی ..... میرے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں نے تو استعفا دینے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اس کا مجھے کوئی غم بھی نہیں ہے۔ مجھے کسی بھی بیرونی ملک میں یہاں سے پانچ گنا زیادہ تنخواہ ملے گی اور ذہنی سکون بھی حاصل ہوگا۔ یہاں تو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہے اور میں مزید غلط روّیے بھی برداشت نہیں کرسکتا۔'' ڈاکٹر اسفندیار نے گویا اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

''نہیں بھئی ..... میں اپنے پیارے دوست کو اس طرح وطن چھوڑنے نہیں دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے ملک میں کسی بھی کام کی پذیرائی اس قدر نہیں جتنا ایک با صلاحیت انسان اُس کا مستحق ہے۔ لیکن پھر بھی آپ کے جانے سے بہت سے معصوم اور بیمار مریضوں کا نقصان ہوجائے گا۔ وہ لوگ جن کی نظریں آپ جیسے ہمدرد محبِّ وطن انسان پر لگی ہوئی ہیں اُن کے لیے کون مسیحا بنے گا؟'' ڈاکٹر فیصل بھی انتہائی جذباتی ہورہے تھے۔

''نہیں بھئی ..... میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ مجھے اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ اس وطن اور ان پھول سے بچوں کو میری ضرورت ہے، لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس ملک کا سارا نظام کھوکھلا ہوچکا ہے اور صحیح سمت سفر کرنے والوں کے

لیے یہاں پر کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں تو یہاں خدمت کے جذبے سے آیا تھا لیکن انتہائی رنجیدہ ہوکر یہاں سے جانے کا فیصلہ کر رہا ہوں۔'' ڈاکٹر اسفند یار دکھ بھرے لہجے میں بولے۔

''اسفند بھائی! میں بھی اپنے ہسپتال میں چند مسائل کا شکار ہوں لیکن آپ کچھ زیادہ ہی حساس آدمی ہیں اس لیے کچھ زیادہ ہی مایوسی کا شکار ہوگئے ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ کو ہر قیمت پر یہاں رُکنا ہوگا۔'' ڈاکٹر فیصل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا جس پر اسفند یار اُن کی باتوں سے کسی حد تک قائل ہوگئے اور بولے۔

''بھئی جانا تو میں خود بھی نہیں چاہتا، لیکن مجبور ہوکر یہ فیصلہ کیا ہے۔ مجھے خود اپنے وطن اور اس کے نونہالوں سے بڑی محبت ہے۔ اگر آپ کے پاس میرے مسئلے کا کوئی حل ہے تو مجھے بتا دیں۔''

''کیوں نہ ہم دونوں مل کر اپنا ہسپتال کھول لیں۔'' ڈاکٹر فیصل نے کہا۔

''آپ کی تجویز بہت اچھی ہے لیکن اس کے لیے اتنا سرمایہ کہاں سے آئے گا؟''

''آپ ہاں تو کریں۔ خدا نے چاہا تو سارا بندوبست ہوجائے گا۔'' ڈاکٹر اسفند یار اپنے دوست ڈاکٹر فیصل کی بات مان گئے۔

دوسرے دن شام کے وقت ڈاکٹر فیصل اور ڈاکٹر اسفند یار کار میں بیٹھے شہر کی مصروف ترین سڑک سے گزر رہے تھے۔ راستے میں ڈاکٹر فیصل نے بتایا کہ وہ اس وقت ایک نیک اور مال دار شخصیت حاجی عثمان سے ملنے جا رہے ہیں جو میرے انتہائی قریبی واقف کار ہیں۔ اور خُدا نے اُنھیں بے حساب دولت کے ساتھ ایک بڑا دل

بھی عطا کیا ہے ۔اُن کی سربراہی میں ہمارے ملک میں کئی ٹرسٹ ہسپتال کام کر رہے ہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اُن سے قرض لے کر اپنا ایک چھوٹا سا ہسپتال قائم کر لیں ۔ میری اس سلسلے میں اُن سے ٹیلی فون پر بات ہو چکی ہے ۔ ڈاکٹر اسفند یار اپنے دوست ڈاکٹر فیصل کی یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوئے ۔ حاجی عثمان نے اُن دونوں کا پُر تپاک استقبال کیا اور ہسپتال بنانے کے لیے اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا ۔اور اُنھیں ہسپتال کے لیے کوئی مناسب جگہ دیکھنے کے لیے بھی کہا ۔

تین دن کی ان تھک محنت کے بعد انھوں نے شہر کے وسط میں ہسپتال کے لیے ایک انتہائی مناسب جگہ تلاش کر لی اور حاجی عثمان کو بھی جگہ کے متعلق بتا دیا ۔جس پر وہ مطمئن ہو گئے ۔ اور دونوں کے جوش و جذبے کی بہت تعریف کی ۔ حاجی عثمان نے انھیں قرض کی رقم کا چیک دیتے ہوئے کہا:

''بھئی میں تمھاری لگن اور ان تھک محنت سے بہت متاثر ہوا ہوں ۔تم واقعی وطن سے محبت کرنے والے نوجوان ہو ۔ قوم کو تم جیسے نوجوانوں کی بڑی ضرورت ہے جو آنے والی نسلوں کی حفاظت کریں ۔ میری دُعا ہے کہ خُدا تمھیں کامیابی عطا کرے ۔''

اس کے بعد چند ضروری کاغذات پر دستخط ہوئے اور دونوں دوست حاجی عثمان کی طرف سے دی گئی رقم کا چیک لے کر پرسکون انداز میں گھر واپس آ گئے ۔ اگلے چند دنوں میں اُنھوں نے ہسپتال کے لیے دیکھی ہوئی جگہ خرید لی ۔اور چند دنوں کے بعد ایک پُر وقار تقریب میں ہسپتال کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تو وہاں حاجی عثمان اور شہر کے دوسرے معزز افراد بھی موجود تھے ۔ یہ لمحات ڈاکٹر فیصل اور ڈاکٹر اسفند یار

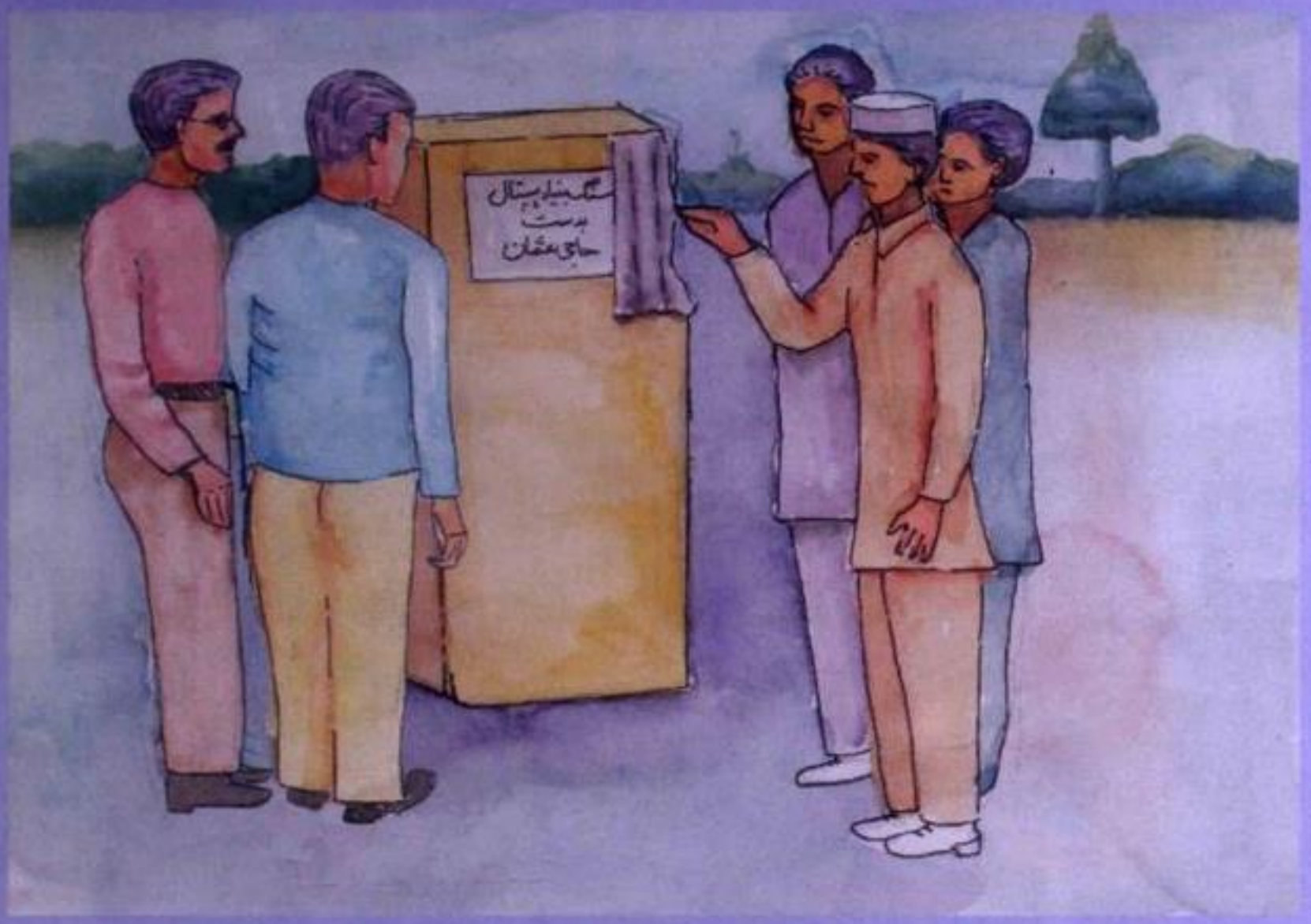

دونوں کے لیے انتہائی خوشی کے تھے۔ ڈاکٹر اسفندیار تصور کی آنکھ سے معذور بچوں کو بھلے چنگے اپنے قدموں پر چلتا اور بھاگتا دوڑتا دیکھ رہے تھے۔

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

ہر روز کی طرح آج بھی تاج دین غباروں اور پلاسٹک کے کھلونے اُٹھا کر شہر کے نسبتاً خوشحال علاقے سے گزر رہا تھا۔ اُس کے کھلونے اور غبارے امیر غریب سب بچے بڑے شوق سے خریدتے تھے۔ تاج دین بچوں سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہ لیتا۔ وہ رزقِ حلال کو اپنی زندگی میں بڑی اہمیت دیتا تھا اور اپنے بچوں کو حرام کا ایک لقمہ بھی دینے کا روادار نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سارا سارا دن گلی محلے میں آوازیں لگا کر کھلونے بیچتا تھا اور جو رقم حاصل ہوتی اُس سے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پال کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا تھا۔ آج بھی وہ اپنی روزی کے سلسلے میں گھر سے نکلا ہوا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ سیٹھ یوسف کی کوٹھی سے دو لوگ ان کے بیٹے کو کاندھے پر اُٹھائے بڑی تیزی سے باہر نکل رہے ہیں اور کامران اُن کے چنگل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ دونوں نے کامران کو باہر کھڑی گاڑی میں ڈالا تاج دین نے یہ منظر دیکھا تو بھاگا ہوا گاڑی کی طرف آیا لیکن اتنی دیر میں گاڑی چل پڑی تھی۔ تاج دین تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتا تھا لہٰذا اُس نے گاڑی کے پیچھے نمبر پلیٹ پر لکھا ہوا نمبر پڑھا اور جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس پر لکھ لیا۔ وہ کچھ دیر تک کھڑا سوچتا

رہا پھر سیٹھ یوسف کی کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ یہاں کچھ لوگ زخمی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ دوسرے کمرے میں گیا تو سیٹھ یوسف کی بیوی کو ایک کرسی کے ساتھ رسیوں سے بندھا ہوا پایا۔ تاج دین نے جلدی سے اُن کی رسیاں کھولیں۔ تاج دین کو دیکھ کر بیگم یوسف کو کچھ حوصلہ ہوا۔

''تت ..... تاج دین ..... وہ ..... وہ ..... میرے بچے کو لے گئے ہیں۔'' بیگم یوسف بولیں۔

کون تھے وہ لوگ بیگم صاحبہ.....؟'' تاج دین نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم ..... لیکن کامران کو ساتھ لے جاتے ہوئے یہ کہہ گئے ہیں کہ پچیس

لاکھ روپے دو گے تو تمھارا بچہ مل جائے گا، ورنہ ہم اس کی جان لے لیں گے۔'' یہ کہہ کر بیگم یوسف پھر رونے لگیں۔

تاج دین نے بیگم یوسف کو بتایا کہ اُس نے اغوا کرنے والوں کی گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا ہے۔ بیگم یوسف نے اُس سے وہ نمبر لے لیا کہ شاید اسی طرح مجرموں کا کوئی سُراغ مل سکے۔ پھر اُنھوں نے اپنے شوہر کو فون کر کے بیٹے کے اغوا کی ساری کہانی سنا دی اور تاج دین کا بتایا ہوا گاڑی کا نمبر بھی لکھوا دیا۔

سیٹھ یوسف پہلے پہل تو پریشان ہو گئے۔ پھر اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے اپنی بیوی کو دلاسا دینے لگے۔ ''بیگم تم فکر نہ کرو خدا بہتر کرے گا۔ میں ابھی ڈی ایس پی نواز خان کو فون کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انھوں نے فون بند کر دیا۔

ڈی ایس پی نواز خان سیٹھ یوسف کے دوست تھے۔ سیٹھ یوسف نے انھیں فون پر ساری تفصیلات بتائیں۔ ڈی ایس پی نواز خان نے فوری طور پر شہر کی ناکہ بندی کرا دی اور مطلوبہ گاڑی کی تلاش شروع ہو گئی۔ بعد میں سیٹھ یوسف ڈی ایس پی نواز خان کے پاس تھانے گئے اور اُنھیں ساتھ لے کر اپنے گھر آ گئے۔ گھر پہنچ کر اُنھوں نے دیکھا کہ ان کی بیگم مسلسل رو رہی ہیں۔ اور ایک کونے میں بیٹھا تاج دین اُنھیں حوصلہ دے رہا ہے کہ خُدا نے چاہا تو کامران جلد مل جائے گا۔ تاج دین کو کامران اور اُس سے کھلونے خریدنے والے دوسرے بچوں سے بہت محبت تھی۔ لہٰذا سیٹھ یوسف کے خاندان پر آنے والی ناگہانی آفت کی وجہ سے وہ اپنی روزی کی فکر بھول کر وہیں بیٹھ گیا تھا۔ سیٹھ یوسف بھی تاج دین سے واقف تھے۔ لیکن ڈی ایس پی نواز

خان اُسے مسلسل گھور رہے تھے۔ اس وقت وہ گھر کے ملازمین سے کامران کے اغوا کے سلسلے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ ابھی تک کوئی ایسا سراغ نہیں ملا تھا کہ جس سے وہ مجرموں تک پہنچ سکیں۔ اچانک انھوں نے تاج دین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''مجھے تو یہ شخص بھی مشکوک لگتا ہے۔''

''نہیں بھائی صاحب ..... یہ تو غریب آدمی ہے۔ غُبارے اور کھلونے بیچتا ہے۔ اتفاق سے یہاں سے گزر رہا تھا کہ کامران کو اغوا ہوتا دیکھ کر گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا اور مجھے بتانے یہاں آ گیا۔ بیگم یوسف نے کہا۔

''نہیں ..... نہیں ..... میرا تجربہ کہتا ہے کہ ایسے لوگ مجرموں سے ملے ہوتے ہیں۔ کیا خبر اس نے آپ کو گاڑی کا نمبر غلط بتا دیا ہو، تاکہ پولیس اُس گاڑی کی تلاش میں لگی رہے اور اصل مجرم شہر سے باہر نکل جائیں۔'' یہ کہتے ہوئے نواز خان نے ایک مرتبہ پھر تاج دین کو گھورا تو ایک لمحے کے لیے اُس کا چہرہ فق ہو گیا۔

''یہ ٹھیک ہے نواز صاحب کہ آپ پولیس والے ہیں اور ہر ایک کو شک کی نگاہ سے دیکھنا آپ کی عادت میں شامل ہے لیکن یہ بے چارہ تو غریب آدمی ہے اور یہ ایسا شخص نہیں ہوسکتا۔'' سیٹھ یوسف نے کہا۔

''ایسا ممکن ہے سیٹھ صاحب! ..... کیوں بھئی کون ہو تم ..... اور کیا چکر چلا رکھا ہے ..... صاف صاف اپنے ساتھیوں کے نام اور اُن کا پتا بتا دو اور یہ بھی کہ کامران کو کہاں چھپا رکھا ہے۔'' ڈی ایس پی نواز خان نے تاج دین کی طرف دیکھتے ہوئے رعب دار آواز میں کہا۔

''صاحب ..... صاحب جی ..... مم ..... میں تو ایک غریب آدمی ہوں اور کھلونے بیچ کر بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔'' تاج دین نے سہمے ہوئے انداز میں کہا اور نواز خان کا شک جیسے یقین میں بدل گیا۔

''تمھارے جیسے لوگ ہی چند سکّوں کے عوض بک جاتے ہیں۔ جلدی بتاؤ کامران کہاں ہے ورنہ میں تمھاری کھال کھینچ لوں گا۔''

''مم ..... میں ..... جی ..... میں ..... تو ..... کچھ نہیں جانتا۔'' تاج دین اس اچانک اُفتاد سے گھبرا گیا تھا۔ اب تو سیٹھ یوسف کو بھی اُس پر شک ہونے لگا تھا۔ لیکن بیگم یوسف اب بھی تاج دین کی حمایت کر رہی تھیں۔

''یہ بے چارہ غریب اور معصوم ہے یہ بے قصور ہے۔ آپ اصل مجرموں کو تلاش کریں۔ بیگم یوسف نے کہا۔

''اصل مجرم یہی ہے بس اسے ذرا ڈرائنگ روم کی سیر کروانی پڑے گی۔'' نواز خان کا ایک ماتحت بولا۔

''میرا خیال ہے سر اسے یہیں ڈرائنگ روم میں لے چلتے ہیں۔'' نواز خان کا دوسرا ماتحت بولا۔ یہ دونوں سپاہی اُس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ کچھ توقف کے بعد نواز خان بولا:

''ٹھیک ہے اس سے اپنے طور پر پوچھ گچھ کرو، لیکن ذرا ہلکا ہاتھ رکھنا۔ میرا خیال ہے یہ جلد ہی سب کچھ اُگل دے گا۔''

نواز خان کا یہ حکم سُن کر دونوں سپاہی آگے بڑھے اور تاج دین کو گھسیٹتے ہوئے دوسرے کمرے کی طرف لے گئے۔ وہ بے چارہ چیختا چلاتا ہی رہ گیا۔ بیگم یوسف بھی بہت برہم ہوئیں کہ اس غریب کو چھوڑ دیں، لیکن ڈی ایس پی یہی کہتا رہا کہ یہ مجرموں کا ساتھی ہے۔ حالاں کہ اُسے انتظار کرنا چاہیے تھا۔ کیوں کہ تاج دین کے بتائے گئے نمبر کی گاڑی کی تلاش پورے شہر میں جاری تھی۔ مجرم کسی وقت بھی گرفتار ہو سکتے تھے۔ مگر اتنی دیر میں دونوں سپاہی تاج دین کو کوٹھی کے ایک دوسرے کمرے میں لے گئے اور تشدد کے ذریعے اُس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ تاج دین بے چارہ تکلیف سے چلانے لگا۔ شاید اُس کا مقدر اچھا تھا کہ اُسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف پولیس کے عملے کا کوئی سپاہی کہہ رہا تھا کہ ہم نے آپ کے بتائے ہوئے نمبر والی

گاڑی پکڑ کر نہ صرف مجرم گرفتار کر لیے ہیں بلکہ کامران کو بھی اُن کی قید سے رہا کروالیا ہے۔ فون سیٹھ یوسف نے اُٹھایا تھا اور اب نواز خان ٹیلی فون پر گفتگو کررہے تھے۔ اتنی دیر میں بیگم یوسف تاج دین کو دونوں سپاہیوں کے شکنجے سے چھڑالائی تھیں۔ اب سیٹھ یوسف، نواز خان اور اُن کے ماتحت سر جھکائے ہوئے شرمندہ کھڑے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد پولیس کے چند سپاہی کامران کو اپنے ساتھ لے کر سیٹھ یوسف کے گھر پہنچ گئے۔

تاج دین کی وجہ سے کامران کی زندگی بچ گئی تھی اور پورا خاندان ایک بڑی آزمائش سے بچ گیا تھا۔ تاج دین خاموش تھا مگر اُس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ کامران کو اپنے سامنے دیکھ کر اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی بھی بھُلا چکا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر کامران کو پیار کیا اور بہت سے کھلونے اور غبارے اُس کے ہاتھ میں پکڑا کر گھر سے باہر جانے لگا۔ سیٹھ یوسف نے اُسے روک لیا اور بولے:

''بھئی ہم سب کو معاف کردو۔ دراصل ہم شدید غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ یہ کچھ پیسے رکھ لو تاکہ کوئی دکان لے کر بہتر کام کرسکو۔'' یہ کہہ کر سیٹھ یوسف نے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر تاج دین کے ہاتھ پر رکھ دی۔ تاج دین نے ایک نظر سیٹھ یوسف کی طرف دیکھا اور بولا:

''سیٹھ صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ میں اپنے چھوٹے سے کام میں بہت خوش ہوں اور اس محنت سے جو مجھے حاصل ہوتا ہے اُس سے اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ گلی گلی محلے محلے پھرنا میری عادت ہوگئی ہے۔ کیوں کہ مجھے یہ سب بچے اپنے بچوں کی

طرح عزیز ہیں۔ میں ان کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ کہہ کر تاج دین نے روپے کامران کے ہاتھ پر رکھ دیے اور ایک مرتبہ پھر پیار سے اُس کا ماتھا چُوما اور ایک معمولی مزدور بڑے بڑے رئیس لوگوں کو اُن کی اپنی ہی نگاہوں میں حقیر بنا کر وہاں سے چل دیا۔

زندہ تمنا

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

جوں جوں شیخ اجمل کی ریٹائرمنٹ کی تاریخ قریب آ رہی تھی، وہ کچھ پریشان سے رہنے لگے تھے۔ شیخ اجمل ایک سرکاری محکمے میں ۱۷ گریڈ کے آفیسر تھے۔ شیخ اجمل نے اپنے بچوں کو ہمیشہ رزقِ حلال کھلایا تھا۔ تمام عمر اُن کے پاس کُھلا پیسا تو کبھی نہ آیا، مگر جو خوشی اور اطمینان انھیں حاصل تھا، وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ شیخ اجمل پانچ وقت کے نمازی اور اسلام سے گہرا لگاؤ رکھنے والے انسان تھے۔ وہ ہر حال میں خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کرتے تھے۔ مگر پچھلے دنوں حکومت کی طرف سے کیے گئے اعلان کے مطابق پینشن اور دیگر واجبات میں کمی کی وجہ سے ان پر ایک پریشانی اور غم و غصے کی کیفیت طاری تھی۔

شیخ اجمل کے تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں سلمٰی اور ریحانہ اور چھوٹا بیٹا ذیشان۔ ذیشان ان دنوں ایم ایس سی کا امتحان پاس کر کے فارغ تھا اور ٹیوشن پڑھا کر اس مہنگائی کے دور میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ شیخ اجمل کی بیوی راشدہ بیگم بھی اپنے شوہر کی طرح ایک نیک دل خاتون تھیں۔ شیخ اجمل کی دونوں بیٹیاں میٹرک کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ چکی تھیں اور ان کی منگنیاں طے ہو چکی تھیں۔ شیخ اجمل کی ریٹائرمنٹ کے بعد اُن دونوں کی شادی کا پروگرام تھا۔ شیخ اجمل کو خاندانی مکان کی فروخت

سے جو حصہ ملا تھا، اس سے انھوں نے چار مرلے کا ایک مکان خرید لیا تھا۔ اس سلسلے میں انھیں اپنے دوست چودھری طفیل سے ایک لاکھ روپے قرض بھی لینا پڑا۔ یہ قرض ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم میں سے ادا کرنا تھا۔ پہلے ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم ساڑھے چھ لاکھ روپے بنتی تھی۔ مگر حکومت کی نئی اسکیم کی وجہ سے یہ رقم ساڑھے چار لاکھ روپے رہ گئی تھی۔ شیخ اجمل صاحب اسی باعث کچھ غم زدہ تھے۔ مگر پھر بھی اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ ان کے افسردہ ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ حج پر جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ چودھری طفیل کے قرض، چھوٹی موٹی دوسری ادائیگیوں، بیٹیوں کی شادی اور گھر کی مرمت وغیرہ کے بعد ان کے پاس صرف ڈیڑھ لاکھ روپے بچتے تھے اور اس رقم سے انھیں کوئی کاروبار بھی کرنا تھا۔ لہٰذا وہ سوچنے لگے کہ اس رقم سے یا تو وہ حج کریں یا کوئی کاروبار کرلیں۔ اسی طرح وقت گزرتا چلا گیا اور وہ دن بھی آ گیا جب شیخ اجمل ریٹائر ہو کر گھر آ گئے۔ ان کے چہرے پر خیر و عافیت سے نوکری ختم کرنے کی طمانیت کے ساتھ ساتھ پریشانی کی چند لکیریں بھی تھیں۔ تقریباً ایک ماہ کے اندر اندر شیخ اجمل کو ان کے سارے واجبات مل گئے۔ انھوں نے بیٹیوں کی شادی کی، قرض بے باق کیا اور شادی کی وجہ سے انھیں گھر کی مرمت اور رنگ و روغن پر بھی کافی پیسے خرچ کرنا پڑے۔ بیٹیوں کے فرض سے سبک دوش ہو کر شیخ اجمل کو کاروبار کی فکر لاحق ہوئی۔ کیوں کہ پینشن کی تھوڑی سی رقم سے گھر کا خرچ چلانا مشکل تھا۔ ان کے بیٹے ذیشان کو بھی کوشش کے باوجود اب تک کوئی نوکری نہیں مل سکی تھی۔ ایک دن انھوں

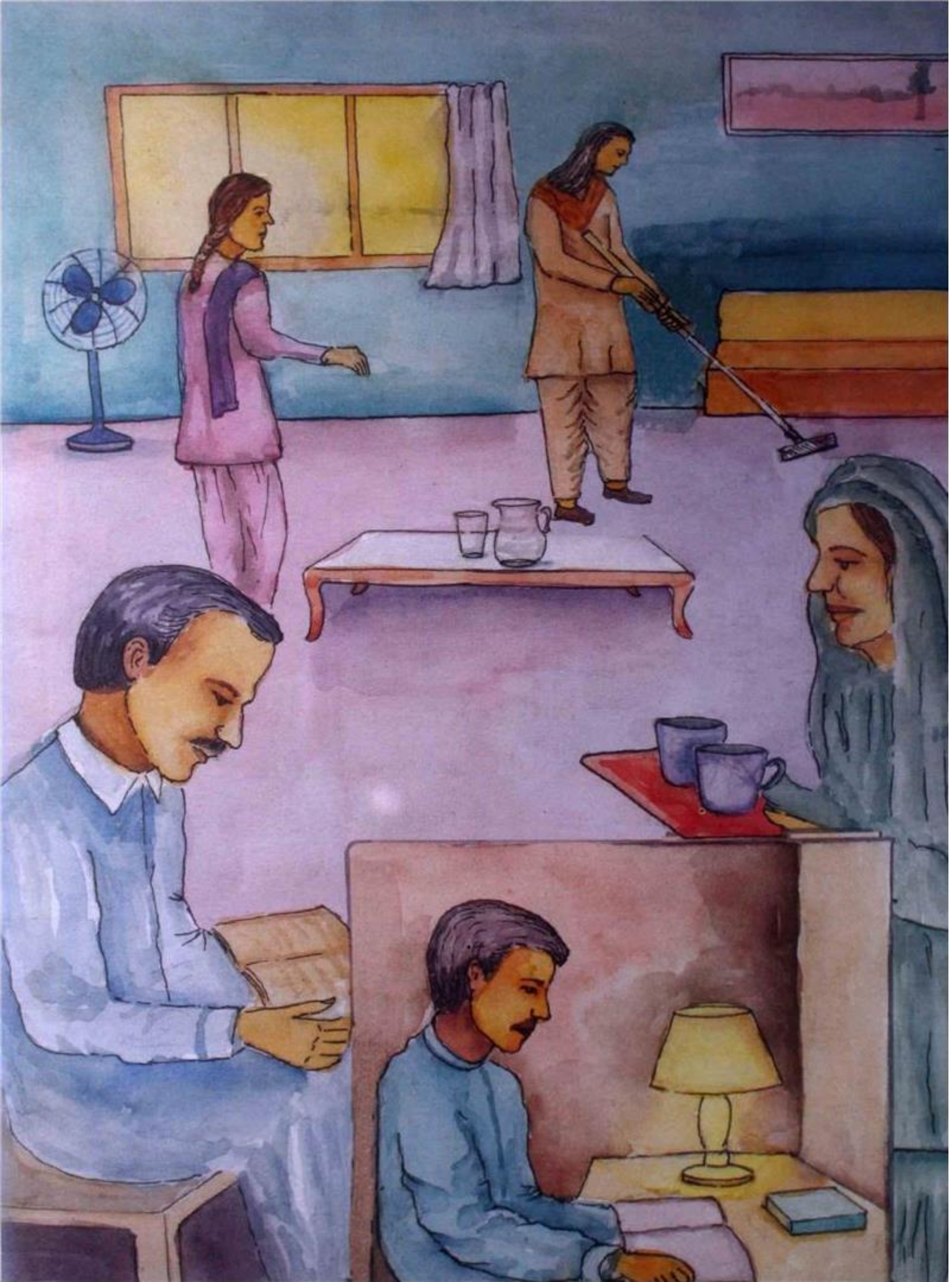

نے اپنے بیٹے ذیشان کو اپنے پاس بلایا اور کہنے لگے:

''بیٹا میں ایک کریانہ جنرل اسٹور کھولنا چاہتا ہوں۔ تمھاری اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟'' یہ کہتے ہوئے شیخ اجمل کے چہرے پر پریشانی کے آثار بھی نظر آرہے تھے۔ ذیشان نے اپنے ابو کے فیصلے کی تائید کی اور طے پایا کہ اجمل صاحب جلد ہی کریانہ اسٹور کھول لیں گے۔

شام کو ذیشان نے اپنی امی سے ابو کی پریشانی کا ذکر کیا۔ انھوں نے اسے بتایا کہ تمھارے ابا جان مجھے اپنے ساتھ حج پر لے جانا چاہتے تھے۔ مگر اب ریٹائرمنٹ پر کم رقم ملنے کی وجہ سے انھوں نے حج کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ لیکن اندر سے وہ بہت دکھی ہیں۔ پھر تمھیں کوئی نوکری بھی نہیں ملی۔ اس لیے وہ گھر چلانے کے لیے فوری طور پر کوئی کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر ذیشان کی امی تو خاموش ہوگئیں مگر ذیشان پریشان ہوگیا۔ وہ کئی اداروں میں نوکری کی درخواست دے چکا تھا اور ٹیوشن کے ذریعے ملنے والی کچھ رقم کی بھی بچت کر لی تھی۔ وہ ان دنوں کمپیوٹر ڈپلوما بھی کر رہا تھا۔ وہ کچھ دن عجیب کشمکش میں مبتلا رہا۔ اس کے دل میں یہ خواہش شدت اختیار کرتی چلی گئی کہ کسی طرح اس کے والدین حج پر چلے جائیں۔ کچھ دنوں بعد اس نے اپنے والد کے پاس جا کر کہا، آپ میرے روزگار کی فکر نہ کریں۔ خدا نے چاہا تو مجھے جلد نوکری مل جائے گی۔ آپ بے فکر ہو جائیں اور حج کے لیے درخواست دے دیں۔ یہ موقع اچھا ہے۔ اس وقت آپ کے پاس رقم موجود ہے۔ کچھ پیسے میں نے بھی جمع کر رکھے ہیں۔ شاید پھر کبھی ہمارے پاس اتنی رقم اکٹھی نہ ہو سکے۔

اس لیے آپ یہ موقع ضایع کیے بغیر درخواست دے دیں اور جب اس پاک زمین پر پہنچیں تو میرے روزگار کی دعا ضرور کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مقدس مقام پر آپ کی دعائیں ضرور قبول فرمائیں گے۔ ذیشان کی ان باتوں سے شیخ اجمل نے دوبارہ حج پر جانے کا ارادہ کرلیا۔ اپنے بیٹے ذیشان کی سوچ پر شیخ اجمل کے خوشی اور فخر کے ملے جلے جذبات تھے۔ ذیشان نے انھیں حج درخواست فارم لا دیے اور شیخ اجمل نے اپنی اور بیوی کی حج درخواستیں جمع کروا دیں۔

حج درخواست جمع ہوئے دو ماہ گزر چکے تھے۔ حج کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ دونوں میاں بیوی درخواست منظور ہونے کی دعائیں کر رہے تھے۔ خدا نے ان کی دعائیں قبول فرمائیں اور انھیں حج پر جانے کی اجازت مل گئی۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے۔ ذیشان بھی بہت خوش تھا کہ اس کے والدین کی دلی خواہش پوری ہو رہی تھی۔

جس دن شیخ اجمل کو حج پر روانہ ہونا تھا۔ اس دن صبح گیارہ بجے کے قریب ڈاکیا آیا اور ایک خط شیخ اجمل کے ہاتھ میں پکڑا کر چلا گیا۔ انھوں نے خط دیکھے بغیر ہی ایک کونے میں رکھ دیا۔ کیوں کہ ان کی رات کی فلائٹ تھی اور وہ تیاریوں میں مصروف تھے۔ دوپہر کو ذیشان باہر سے آیا تو اس کی نظر اس خط پر پڑی جس پر اس کا نام اور پتا درج تھا۔ اس نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اس کی عبارت پڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے خوشی کے عالم میں اپنے والد اور والدہ کو آواز دی۔ دونوں وہاں پہنچے۔

ذیشان نے بتایا کہ اسے ایک گورنمنٹ کالج میں لیکچرار کی ملازمت مل گئی ہے۔ شیخ اجمل اوران کی بیوی کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔اس دوران ذیشان کی دونوں بہنیں بھی وہاں آ گئیں۔ جب انھیں اپنے بھائی کی نوکری کی خبر ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئیں۔شیخ اجمل نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔وہ ذیشان کو گلے لگاتے ہوئے مبارک باد دینے لگے اور بولے:

''بیٹا اگر انسان کے ارادے نیک ہوں اور خدا پر بھروسا ہو تو وہ اپنے بندے کی دعا قبول فرماتا ہے۔تم نے ہمیں خدا کے گھر حاضری دینے کے لیے کہا اور ہمارے ٹوٹتے ارادے کو مضبوط کیا، اسی لیے تمھیں اپنے اس ارادے کا اجر ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی مل گیا ہے۔اللہ تعالیٰ تو نیک کام کرنے کا ارادہ کرنے پر بھی اسکے اجر سے نواز دیتے ہیں۔'' شیخ اجمل بول رہے تھے اور گھر کے تمام افراد کے چہرے خوشی اور اطمینان کے تاثرات سے بھرپور تھے۔ ذیشان کا چہرہ ان سب میں نمایاں تھا۔ذیشان کو یہ خوشی اور کامیابی اپنے خدا پر کامل یقین کے سبب ہی حاصل ہوئی تھی۔

ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

مُحبت مُجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

انور حسین ایک چھوٹے سے گاؤں میں اپنی بیوی مریم اور بچوں شاہد اور ساجد کے ساتھ پرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ اُس کے پاس بہت زیادہ زمین اور جائیداد تو نہ تھی مگر جو کچھ بھی تھا اس پر وہ بہت خوش تھا۔ انور حسین اپنی تھوڑی سی زمین پر کھیتی باڑی کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی ساجدہ کو دُنیاوی تعلیم تو نہ دلوا سکا تھا مگر اُس کی تربیت اور دینی تعلیم میں کوئی کمی روا نہ رکھی تھی۔ جب کہ شاہد کا

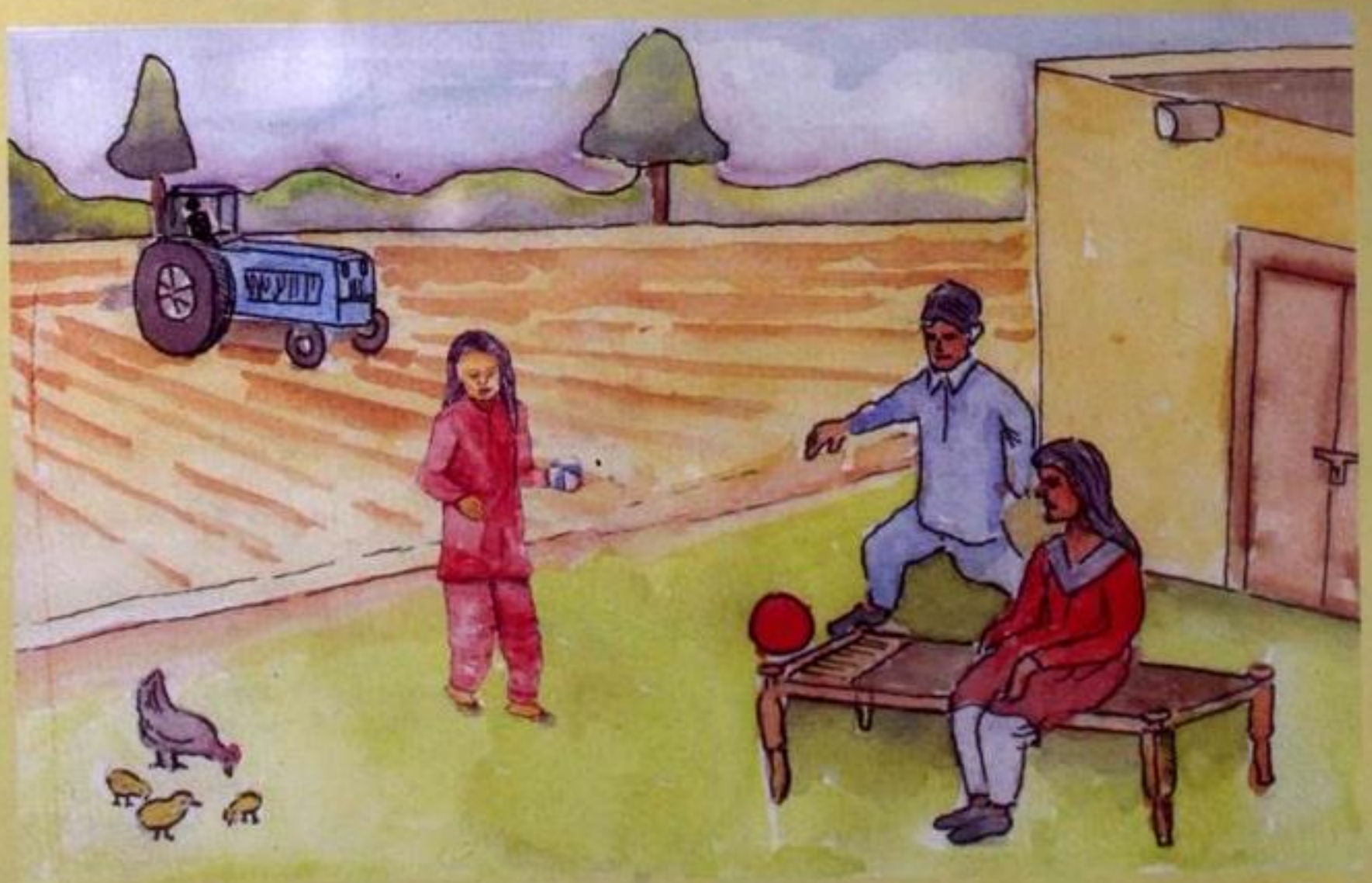

ذوق وشوق دیکھتے ہوئے اُسے اسکول میں داخل کروادیا گیا تھا اور وہ گاؤں کے اسکول سے پانچ جماعتیں پاس کرنے کے بعد جس ہائی اسکول میں داخل ہوا تھا وہ گاؤں سے ملحقہ شہر میں تھا۔

شاہد ایک ذہین، محنتی اور با اخلاق لڑکا تھا۔ شاہد نے میٹرک کا امتحان دیا تھا اور اُسے نتیجے کا انتظار تھا۔ وہ اپنی کامیابی کے لیے پانچوں وقت نماز پڑھ کر خُدا کے حضور دعا مانگتا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھوں میں مستقبل کے اَن گِنت سُہانے خواب سجا رکھے تھے اور اُسے خدا کی ذات سے پوری اُمید تھی کہ اُس کی مشکلیں آسان ہوں گی اور وہ اپنی محنت کے بل بوتے پر ساری مشکل منزلیں طے کرتا چلا جائے گا۔ بالآخر نتیجہ آ گیا اور شاہد نمایاں نمبروں کے ساتھ پاس ہوگیا۔ اُس کے پاس ہونے پر اُس کے والدین بہت خوش تھے۔ شاہد نے اپنے والد انور حسین سے شہر کے کالج میں داخلہ لینے کی بات کی تو وہ خاموش ہو گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولے:

''بیٹا تمھیں شاید گھر کے حالات کی خبر نہیں۔ ان دنوں بڑی مشکل سے گزارا ہو رہا ہے اس لیے میں تمھیں مزید تعلیم نہیں دلوا سکتا۔ بہتر ہے کہ تم کھیتی باڑی میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔

والد کی باتیں سُن کر ایک لمحے کے لیے تو شاہد پریشان ہوگیا۔ اُس نے مستقبل میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایک تعلیمی ادارہ کھولنے کی منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ وہ محنت کر کے معاشرے میں اپنا ایک مقام بنانا چاہتا تھا لیکن اب اسے خوابوں کی تعبیر ناممکن نظر آ رہی تھی۔ دو تین روز اسی پریشانی کے عالم میں گزر گئے۔ پھر اس نے ایک فیصلہ

کرلیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے والد کی مالی مدد کے بغیر مزید تعلیم حاصل کرے گا۔ اس مقصد کے لیے اسے اپنے والد کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ لہٰذا ایک دن وہ اپنے والد کے پاس گیا اور انتہائی احترام سے کہا:

''ابا جان آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ معاشی حالات ایسے ہیں کہ آپ میرے تعلیمی اخراجات کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب میں آپ پر مزید بوجھ نہیں بنوں گا بلکہ اپنی محنت سے خود کو اس قابل بناؤں گا کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی روزگار بھی تلاش کر سکوں۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی سبب ضرور بنا دے گا۔ آپ بس میرے لیے دُعا کریں۔''

بیٹے کی پُر یقین باتیں سُن کر انور حسین بہت خوش ہوئے۔ اُنھوں نے شاہد کو اجازت دے دی، لیکن ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ یہ سب کیسے ممکن ہوگا۔ اگلے چند دن شاہد کے لیے بڑی بے چینی کے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح وہ اپنے آپ کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنی تعلیم بھی جاری رکھ سکے اور کوئی چھوٹا موٹا کام یا کاروبار بھی کرلے، جس سے اُسے اتنی بچت ہو جائے کہ اُس کے تعلیمی اخراجات پورے ہوسکیں ..... لیکن کاروبار کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ اسی سوچ میں پندرہ دن گذر گئے اور ادھر مختلف کالجوں میں سالِ اوّل کے داخلے شروع ہوگئے شاہد نے اسلامیات کے اُستاد نادر صاحب سے سُن رکھا تھا کہ نماز باجماعت پڑھ کر صدقِ دل سے دُعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ لہٰذا اُس نے پانچ وقت کی نماز باجماعت پڑھنی شروع کر دی۔ گاؤں کی مسجد کے امام طفیل صاحب نے جب پندرہ

سولہ سال کے نوجوان کو باقاعدگی سے نماز پڑھتے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور شاہد سے کہنے لگے:

''بیٹا تمھاری عمر کے اکثر نوجوان اپنی کسی حاجت کے لیے خُدا کے حضور دعا مانگتے ہیں، اور مسئلہ حل ہونے پر نماز اور دُوسرے احکامِ الٰہی بھُلا دیتے ہیں۔ میری نصیحت ہے کہ دُعا خلوصِ نیت سے کرنا۔ خُدا نے چاہا تو تمھارے مسائل حل ہوں گے اور پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ لیکن بیٹا یاد رکھنا کہ نماز نہ چھوڑنا اور حتی الامکان باجماعت نماز ادا کرنے کی کوشش کرنا۔ خدا تمھیں کامیابی نصیب فرمائے۔'' امام صاحب کی اِن نصیحتوں اور دعائیہ کلمات نے شاہد کے دل پر بڑا اثر کیا اور اُس نے یہ عہد کر لیا کہ زندگی میں کبھی نماز سے غفلت نہیں برتے گا۔

چند روز بعد شاہد عصر کی نماز پڑھ کر گھر پہنچا تو اُسے اپنے والد کے کمرے سے کسی اجنبی شخص کی آواز سنائی دی۔ شاہد اندر داخل ہوا تو وہاں ایک پُر وقار شخصیت

کے مالک ایک صاحب اس کے والد سے باتیں کر رہے تھے۔ اُنھوں نے قیمتی اور خوبصورت لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ شاہد نے سلام کیا تو اُنھوں نے پیار سے شاہد کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ شاہد کے والد نے اُن صاحب کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ اُن کے دوست عارف خان ہیں اور آج کل شہر میں مقیم ہیں۔ عارف خان بیس برس قبل اپنی ساری زمین بیچ کر شہر چلے گئے تھے۔ وہاں ان کا اچھا خاصا کاروبار تھا اور اُن کا شمار امیر لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک طویل عرصے بعد اپنے گاؤں واپس آئے تھے۔ اُنھیں انور حسین کی محبت یہاں کھینچ لائی تھی۔ باتوں باتوں میں جب عارف خان نے شاہد سے اُس کی تعلیم کے بارے میں پُوچھا تو اُس نے بتایا کہ وہ میٹرک کا امتحان پاس کر چکا ہے۔

''بیٹا کیا آگے نہیں پڑھو گے۔'' عارف خان نے پیار بھرے لہجے میں پُوچھا تو شاہد کے چہرے پر چند لمحوں کے لیے فکر کے آثار نمودار ہو گئے۔ پھر وہ انتہائی احترام سے بولا:

''انکل میں کوشش کر رہا ہوں۔ خُدا نے چاہا تو داخلہ مل جائے گا۔''

''لیکن بیٹا اب تو بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ اگر کالج میں داخلہ لینا چاہتے ہو تو جلد میرے پاس شہر چلے آؤ ورنہ کہیں داخلے بند نہ ہو جائیں۔'' عارف خان نے کہا۔

شاہد خاموش ہو گیا۔ لیکن عارف خان جہاں دیدہ آدمی تھے۔ فوراً سمجھ گئے کہ کوئی ایسا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے شاہد اب تک کسی کالج میں داخلہ نہیں لے سکا ہے۔

عارف خان اپنے دوست انور کے مالی حالات سے واقف تھے۔ لہٰذا وہ انور حسین کو مخاطب کر کے بولے:

''بھائی انور یہ واقعی میری کوتاہی ہے کہ میں تم لوگوں کی خبر نہیں لے سکا۔ اگر مجھے تم اپنا پرانا اور قریبی دوست سمجھتے ہو تو شاہد کو میرے ساتھ شہر بھیج دو۔ اس کے سارے تعلیمی اخراجات میں برداشت کروں گا۔ دیکھو انکار نہ کرنا۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھارے حالات ٹھیک نہیں۔ اگر کوئی اور مسئلہ ہے تو وہ بھی بتاؤ۔'' عارف خان کی باتیں سن کر انور حسین کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے:

''بھائی تم ٹھیک سمجھے ہو، لیکن میں یہ بات کیسے گوارا کرلوں کہ میرے بیٹے کا سارا تعلیمی بوجھ تم اُٹھاؤ۔''

''بھئی کمال کرتے ہو..... میں تمھارا دوست ہی نہیں، بھائی بھی ہوں۔ بیٹا اپنے ابا کو سمجھاؤ۔'' عارف خان نے شاہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''انکل ابا جان ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اجازت دیں تو آپ مجھے کچھ رقم اُدھار دے دیں اور میں کچھ عرصے کے لیے آپ کے گھر پر رکنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ اس سے زیادہ میں آپ پر بوجھ نہیں بن سکتا۔'' شاہد نے انتہائی احترام سے کہا اور عارف خان ایک کم عمر لڑکے کی پختہ سوچ سے بہت متاثر ہوئے۔

''بھئی تم دونوں باپ بیٹا تکلفات میں پڑ گئے ہو۔ خیر تم جس طرح چاہو ویسا ہی ہوگا..... بس میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اعلیٰ تعلیم حاصل کرو۔'' عارف خان نے کہا۔

''انکل آپ مجھے اپنا پتا دے جائیں۔ میں چند دنوں میں آ جاؤں گا۔ لیکن پہلے ابا جان کی اجازت ضروری ہے۔'' شاہد نے اپنے والد کی طرف دیکھتے ہوئے

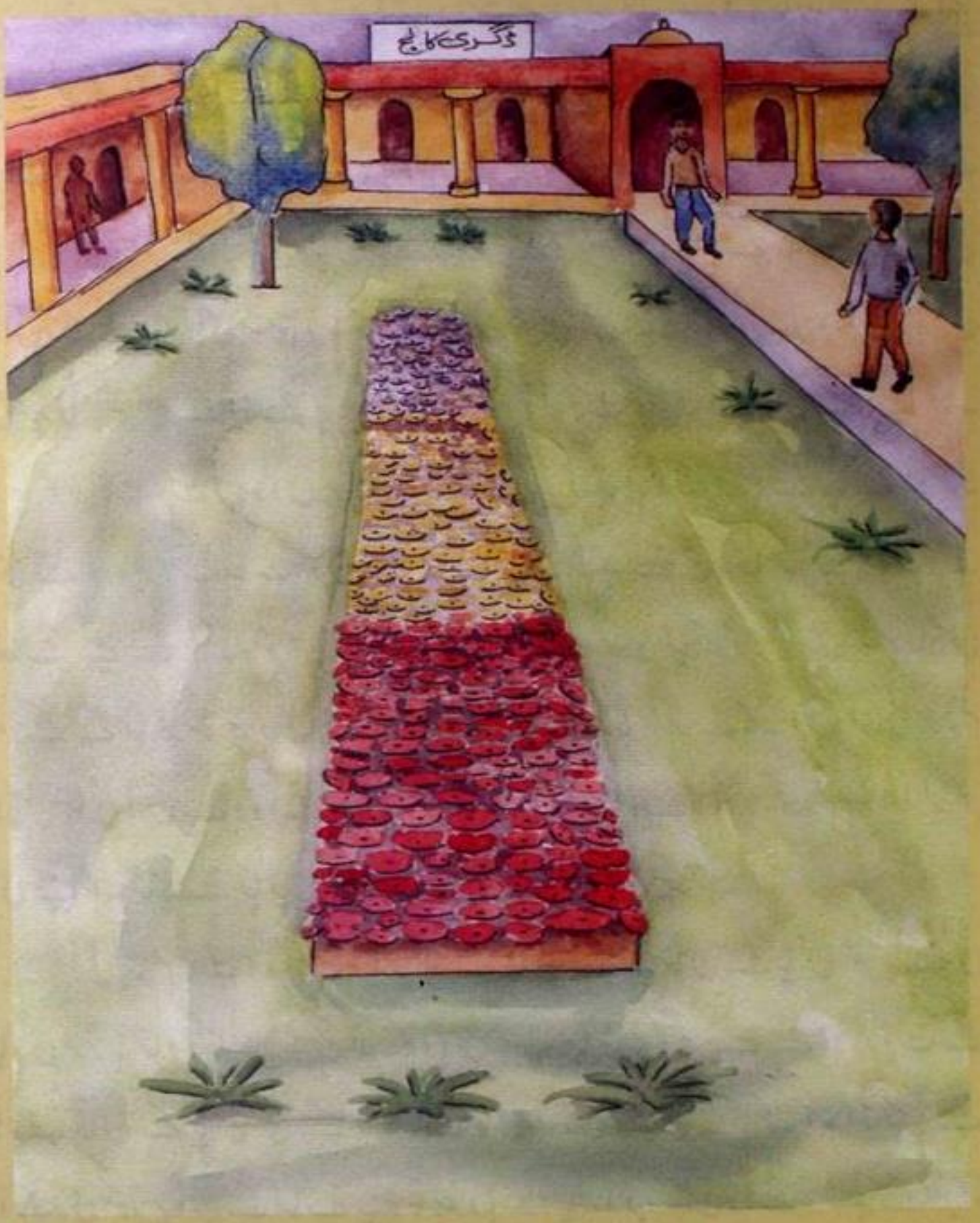

کہا۔

''بھئی میری طرف سے تمھیں اجازت ہے۔'' انور حسین نے کہا۔

شاہد بہت خوش ہوا۔ اُسے ایک راستہ نظر آ گیا تھا۔ عارف خان مزید کچھ دیر وہاں ٹھہر کر رخصت ہو گئے اور جاتے ہوئے اپنا مکمل پتا بھی دے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد شاہد گہری سوچ میں پڑ گیا۔ وہ چند دن بعد عارف خان کے پاس جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے وہ شہر میں تعلیم کے ساتھ ساتھ حصولِ رزق کے سلسلے میں بھی سوچ رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ اگلی صبح چاچا مظفر علی کے اڈے پر چلا گیا جہاں وہ فروٹ چاٹ اور دہی بھلّے بیچتا تھا۔ چاچا کا یہ کام بہت زوروں پر چلتا تھا۔ گاؤں کے تمام لوگ اس کے بنائے ہوئے دہی بھلّے اور فروٹ چاٹ شوق سے کھاتے تھے۔ شاہد نے سن رکھا تھا کہ شہر کے لوگ کھانے پینے کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ اُس نے سوچ لیا کہ وہ شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دہی بھلّے اور فروٹ چاٹ کا کام کرے گا۔ اس طرح جو رقم حاصل ہو گی اُس سے وہ اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرے گا اور کچھ رقم وہ بچا کر گھر بھی بھیجے گا۔ شاہد نے چاچا مظفر سے یہ کام دو دن ہی میں سیکھ لیا۔

اگلی شام جب وہ اپنے ابا جان کے ساتھ عارف خان کے پاس شہر جانے کی تیاری کر رہا تھا وہ خاصا مطمئن تھا۔ دونوں باپ بیٹا شام کو گھر سے نکلے اور رات گئے عارف خان کے پاس پہنچ گئے۔ عارف خان اُنھیں انتہائی پُرتپاک انداز میں ملے اور فوری طور پر اُن کے کھانے پینے کا بندوبست کیا۔ انور حسین رات کو شاہد کے ہمراہ

وہیں رہے اور صبح اُٹھ کر واپس گاؤں چلے آئے۔ اب شاہد وہاں اپنوں سے دور تنہائی محسوس کر رہا تھا مگر عارف خان اُس کی بیوی اور بچوں نے بڑے اچھے انداز سے اُس کی دل جوئی کی کہ کہیں وہ اُداس نہ ہو جائے۔ حالاں کہ شاہد خود کو ماحول کے مطابق ڈھال لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

اس نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے عارف خان سے رقم کا بندوبست کرنے کی درخواست کی۔ عارف صاحب جو اُس کے لیے تین مختلف کالجوں کے فارم بھی لے کر آئے تھے بولے:

''بیٹا یہ رقم تمھیں کل صبح مل جائے گی۔ تم یہ داخلہ فارم پُر کر دو۔'' شاہد نے داخلہ فارم پُر کر دیے۔ اگلی صبح اُسے مطلوبہ رقم بھی مل گئی۔ اُس نے اُسی دن عارف صاحب کی اجازت سے اُن کے نوکر کو ساتھ لیا اور بازار سے کچھ ضروری سامان، سبزی اور پھل وغیرہ خرید لایا۔ ریڑھی اُس نے روزانہ کرائے پر حاصل کر لی تھی۔ اگلے دن وہ باورچی خانے میں مختلف برتنوں میں سامان تیار کرنے میں مصروف تھا۔ جب اُس نے چیزیں تیار کر لیں تو ریڑھی پر سجا کر قریب بازار کی طرف فروخت کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد اس کا کاروبار چل نکلا اور اچھی خاصی رقم حاصل ہو گئی۔ شاہد کو کالج میں داخلہ بھی مل گیا تھا۔ وہ صبح کے وقت پڑھنے جاتا اور شام کو اپنا کاروبار کرتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاہد کا کاروبار بہتر ہوتا چلا گیا اور وہ اپنے تعلیمی مراحل بھی بخوبی طے کرتا چلا گیا۔ اب اُس نے کاروبار کے سلسلے میں دو کاری گر بھی رکھ لیے تھے اور ایک چھوٹی سی دوکان بھی کرائے پر لے لی تھی۔

شاہد اپنی ہر طرح کی مصروفیت کے باوجود پانچ وقت نماز ادا کرتا اور خدا کا شکر بجالاتا تھا۔ اُسے گاؤں کی مسجد کے امام بابا طفیل کی باتیں اچھی طرح یاد تھیں۔ جن دنوں شاہد نے بی کام کا امتحان پاس کیا اور ایم بی اے میں داخلہ لیا تو اُس نے عارف صاحب سے اجازت لے کر ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ عارف صاحب نہیں چاہتے تھے کہ شاہد کسی الگ مکان میں رہے۔ شاہد نے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سمجھایا کہ وہ اپنے والدین اور بہن کو شہر میں لانا چاہتا ہے اور اُن پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ عارف خان نے اُسے لاکھ سمجھایا کہ اُن کی کوٹھی بہت بڑی ہے اور وہ اپنے گھر والوں کو یہاں منتقل کر سکتا ہے۔ لیکن شاہد نہ مانا اور عارف خان کو اُس کے لیے الگ کرائے کا مکان ڈھونڈنا پڑا۔ مکان ملتے ہی وہ گاؤں سے اپنے اہل خانہ کو شہر لے آیا۔ اب انور حسین کو کھیتی باڑی کی ضرورت نہ تھی۔ وہ شاہد کی دکان پر اس کے کام کی نگرانی کے لیے بیٹھ گئے اور شاہد دن رات پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ اگر اُسے اپنے اِردگرد کوئی مستحق طالب علم نظر آتا تو وہ اس کی ہر ممکن مدد کرتا اور بہت خوش ہوتا۔ انور حسین اور اُن کی بیوی اپنے بیٹے کی کامیابی کے لیے دن رات دعائیں کرتے اور بیٹے کو ترقی کرتے دیکھ کر اُن کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی تھیں۔ شاہد نے اس دوران عارف خان سے لیا ہوا قرض بھی اُتار دیا تھا۔

ان دنوں وہ ایم بی اے کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کے مختلف کورسز بھی کر رہا تھا کہ یہ جدید دور کا تقاضا تھا۔ ایم بی اے کرنے کے بعد اسے ایک جگہ سے اچھی ملازمت کی پیش کش ہوئی مگر اُس کا پروگرام کچھ اور تھا۔ دراصل اُس نے کچھ عرصہ قبل پیسے جمع

کر کے زمین خریدی تھی جہاں وہ ایک ایسے کالج کا سنگِ بنیاد رکھنا چاہتا تھا جہاں غریب اور حق دار طالب علم مفت تعلیم حاصل کریں۔ اس سلسلے میں وہ شہر کے مخیّر حضرات سے چندہ لینے کا بھی خواہاں تھا۔ لہٰذا جس دن وہ اپنے والد کے ساتھ ایک خوبصورت کارڈ لے کر عارف صاحب کے پاس گیا تو کارڈ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھتے ہی اُنھوں نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ کارڈ پر شاہد کی طرف سے کالج کا سنگِ بنیاد رکھنے کا دعوت نامہ تھا۔ یہ رسم وہ عارف صاحب کے ہاتھوں مکمل کروانا چاہتا تھا۔ تین دن بعد شاہد کے کالج کی سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شہر کے بڑے بڑے لوگ موجود تھے۔ عارف خان نے پہلی اینٹ نصب کرنے کے ساتھ ہی اپنی طرف سے کالج کے لیے ایک لاکھ روپے چندہ دینے کا اعلان کیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے مخیّر حضرات نے کالج کو چندہ دینے کا اعلان کر دیا۔ شاہد نے یہ رقم لینے سے انکار نہیں کیا کیوں کہ یہ پیسہ اُس کا نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کی امانت تھا اور یہ وہ لمحے تھے جب اطمینان اور خوشی سے شاہد کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

میرِ کارواں

نگہ بُلند، سُخن دل نواز، جان پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

ولید اسکول سے واپس آیا تو اُسے اپنی والدہ کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کے چچا ناصر امین تین برس بعد اپنی بیگم اور دونوں بچّوں عامر اور ریحانہ کے ساتھ وطن واپس آ رہے ہیں۔ ناصر صاحب اپنی فیملی کے ساتھ کافی عرصے سے ایک عرب ملک میں رہائش پذیر تھے۔ ولید بہت خوش ہوا کہ اس بار چھٹیوں میں اُس کا وقت بہت اچھا گزر جائے گا۔ ولید کے چچا اُس سے بہت محبت کرتے تھے اور جب بھی باہر سے آتے اُس کے لیے ڈھیروں تحائف لاتے تھے۔ ولید نے ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعے اپنے چچا ناصر اور اُن کے بچوں سے رابطہ رکھا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے خاصے مانوس تھے۔

ناصر چچا اور ان کے اپنے بیوی بچوں کی آمد پر ولید کے سارے گھر والے بہت خوش تھے۔ اگلے چند گھنٹوں میں وہ ایک دوسرے سے گھل مل چکے تھے۔ ولید نے جلد ہی یہ محسوس کرلیا کہ عامر پچھلے تین برسوں میں کہیں زیادہ ذہین اور پرکشش شخصیت کا مالک بن چکا ہے۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ عامر میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ وہ نہایت نرم خُو، مخلص اور بڑوں کا احترام کرنے والا لڑکا تھا۔ عامر کو ہر موضوع پر گفتگو کرنے میں اچھی خاصی

مہارت حاصل تھی۔ اکثر اوقات وہ مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے قرآن و حدیث کے حوالے دیتا جو کہ اُس کے قرآن و حدیث کے گہرے مطالعے کا نتیجہ تھے۔ نماز فجر سے دن کا آغاز، قرآن پاک کی تلاوت و ترجمہ اور بقیہ نمازوں کی بروقت ادائیگی اُس کا معمول تھا۔ اس کے برعکس ولید شاید ہی کبھی نماز فجر کے لیے اُٹھا ہو۔ اُس کی باقی نمازیں بھی ادا ہونے سے رہ جاتی تھیں۔

جب اُس نے اپنے ہم عمر کزن عامر کی دین سے گہری وابستگی اور مذہب کے حوالے سے گفتگو اور علمیت دیکھی تو اُسے اپنی کم علمی اور دینی معاملات میں بے توجہی کا بہت شدت سے احساس ہوا۔ حالاں کہ ولید ذہانت میں کسی سے کم نہ تھا اور کورس کی کتابوں کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی کتابیں پڑھتا تھا۔ لیکن جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو اس حوالے سے اُسے صرف چند ضروری باتیں معلوم تھیں۔ دین کے معاملے میں عامر کا مُدبّرانہ انداز دوسرے شخص کو نہ صرف متاثر کرتا تھا، بلکہ پوری طرح قائل بھی کر لیتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عامر سے اس کی ہر موضوع پر ماہرانہ گفتگو کا راز پوچھے لیکن شرمندگی کے احساس نے اسے پوچھنے کا موقع نہ دیا۔ اسی کشمکش میں کئی دن گزر گئے اور عامر کی واپسی کا وقت قریب آ گیا۔ جب عامر ولید سے مل کر رخصت ہونے لگا تو اُس نے بالآخر یہ پوچھ ہی لیا کہ اُسے ہر موضوع خصوصاً مذہب کے حوالے سے اتنی معلومات کیسے حاصل ہوئیں۔ کیا وہ سارا دن مختلف کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے یا کوئی اور بات ہے.....؟ اس کی یہ بات سُن کر عامر مسکرا دیا اور انتہائی سلجھے ہوئے انداز میں کہنے لگا۔

''ولید بھائی صرف کتابوں کے مطالعے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان پر عمل بھی ضروری ہے۔ میں کتابیں پڑھتا بھی ہوں اور ان پر عمل بھی کرتا ہوں لیکن سب سے اہم ترین بات ہمارے اسکول کا تعلیمی نظام ہے جہاں جدید علوم اور مذہبی تعلیم دونوں پر برابر توجہ دی جاتی ہے۔ اس جدید طرز کے اسکول میں جدید سائنسی علوم اور مذہبی تعلیمات کو مربوط کر کے پڑھایا جاتا ہے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلام کو عملی زندگی میں برتنے کے کیا تقاضے ہیں اور اسلام کا جدید علوم و سائنس سے کیا تعلق ہے۔ غرض اس سلسلے میں درپیش مشکلات کو باہم گفتگو اور مباحثے کے ذریعے بہت اچھے انداز میں سلجھایا جاتا ہے۔''

ولید کو نہ صرف اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا بلکہ اس کے اندر کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے عامر کا شکریہ ادا کیا جس نے ولید کی ایک طرح سے مدد کی تھی۔ عامر کے جانے کے بعد ولید نے اپنے آپ کو اس سوچ اور فکر کے مطابق ڈھالنے کی

کوشش شروع کردی۔ سب سے پہلے اُس نے اپنے اسلامیات کے اُستاد ریاض صاحب سے دین کے متعلق سوالات پوچھنے شروع کر دیے۔ اور اُن کی رہنمائی میں مختلف اسلامی کُتب کا مطالعہ کرنے لگا۔ چوں کہ اُس کے اندر ایک بڑی تبدیلی کا آغاز ہو چکا تھا، لہٰذا اُس نے اپنے والد کے ساتھ جا کر شہر کے چند بڑے علمائے دین سے بھی مذہب کے سلسلے میں رہنمائی حاصل کرنا شروع کی۔ اُس نے اپنے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے بی اے کا امتحان پاس کرلیا اور بی ایڈ میں داخلہ لے لیا۔ آئندہ چند سالوں میں وہ ایم اے، ایم ایڈ تک تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ لیکن کسی سرکاری اسکول یا کالج میں ملازمت حاصل کرنے کی بجائے اُس کی منصوبہ بندی کچھ اور تھی۔ عامر نے اسے ایک راستہ دکھایا تھا۔ وہ نئی نسل کے لیے ایک ایسا اسکول قائم کرنا چاہتا تھا جس میں جدید علوم کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی بھرپور اہمیت حاصل ہو۔ اور بحیثیت مسلمان اچھی زندگی گذارنے کے لیے نئی نسل کو دین سے پوری طرح آگاہی دی جا سکے۔

کئی برس گزرنے کے بعد بھی ولید کا عامر سے رابطہ برقرار رہا تھا۔ اس دوران عامر بھی کئی مرتبہ اُن کے وطن آ چکا تھا۔ عامر دوسرے ملک میں ایک اسلامی یونی ورسٹی میں لیکچرار تھا۔ وہ آج بھی قدم قدم پر ولید کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ولید نے کچھ پیسے جمع کر کے اسکول کے لیے زمین خرید لی تھی۔ پھر اُس نے حکومت سے قرض لے کر اسکول کی تعمیر کا آغاز کر دیا۔

اسکول مکمل ہونے کے بعد جب پڑھائی کا آغاز ہوا تو کسی کے وہم و گمان میں

بھی نہ تھا کہ ولید ایک منفرد اسکول کی بنیاد رکھ چکا ہے۔ والدین اپنے بچوں کو اس اسکول میں داخلہ دلا کر مطمئن تھے۔ وہ مختلف موضوعات پر طلبہ کی قرآن و حدیث کی روشنی میں رہنمائی ہوتے دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ ولید کے اسکول میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے لے کر مذہب کے سلسلے میں ہر طرح کی رہنمائی کا سلسلہ جاری تھا۔ اس کے علاوہ طالب علموں کو شروع سے ہی انگریزی اور اُردو زبان سکھانے پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ عامر نے جو کچھ اب تک سیکھا تھا وہ اب نئی نسل میں منتقل کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ولید نے عامر سے بھی دو قدم آگے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب یہ کارواں آگے بڑھا تو ولید کے اسکول کی شاخیں شہر در شہر پھیلتی چلی گئیں اور دوسرے اسکولوں نے بھی اپنے اداروں کو ولید کے اسکول کی طرز پر چلانا شروع کر دیا۔ یوں ولید کی عزت اور شہرت پورے ملک میں پھیل گئی۔

اُس دن ولید کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا جب ایک خوب صورت صبح شہر کے تمام بڑے اسکولوں نے اُس کے اعزاز میں ایک خوب صورت تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ اس تقریب میں گورنر صاحب کو بحیثیت صدرِ محفل مدعو کیا گیا تھا۔ بہت سے تعلیمی اداروں کے بچّے، اُن کے والدین اور اعلیٰ سرکاری افسر بھی وہاں موجود تھے۔ آج ولید کو منفرد طرز کے اسکول قائم کرنے اور نئی نسل کو اپنے دین کے بنیادی اُصولوں سے آگاہ کرنے کے باعث اعلیٰ کارکردگی کے اعزاز سے نوازا جا رہا تھا۔ مقرِرین نے اُسے بھرپور انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ گورنر صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں نئی نسل کی جدید خطوط پر تربیت کرنے پر ولید کی بھرپور تعریف کی۔ جب

تالیوں کی گونج میں گورنر صاحب نے ولید کو طلائی تمغہ اور شیلڈ پیش کی تو بہت سے اخباری نمائندے اور فوٹو گرافر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ولید کے لیے یہ لمحے انتہائی خوشی کے تھے۔ اُس نے اخباری نمائندوں کو اپنے اندر پیدا ہونے والی تبدیلی اور اُس کے محرک یعنی اپنے کزن عامر کے بارے میں بھی بتایا اور کہا کہ جب اُس کے اندر کچھ کرنے کا عزم پیدا ہوا تو اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ ایک ایسے ادارے کی بنیاد رکھے گا جس میں نئی نسل کو جدید علوم کے ساتھ ساتھ اپنے دین کے بارے میں بھی اس قدر معلومات ضرور حاصل ہو جائیں کہ وہ فخر سے اپنے آپ کو مسلمان کہلوا سکیں۔

اگلے دن کے اخبارات میں ولید کے بیانات شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئے۔ اخبارات کے ذریعے اس کی شہرت پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔ شام کو اُس کے چچا ناصر اور کزن عامر کی طرف سے مبارک باد کا فون آیا۔ وہ تقریب کا احوال اخبارات میں پڑھ چکے تھے۔ اپنے چچا اور عامر سے گفتگو کرتے ہوئے ولید کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

غیرت ہے بڑی چیز

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

مَلِک طاہر شہر کے ایک کامیاب بزنس مین تھے۔ خدا نے اُنھیں نہ صرف بے شمار دولت سے نوازا تھا بلکہ وہ اپنے سینے میں ایک دردمند دل بھی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے دفتر اور کارخانے میں کام کرنے والے سارے ملازمین اپنا مسئلہ بلا جھجک اُن کے سامنے بیان کر دیتے تھے۔ مَلِک طاہر بھی حتی الامکان اپنے ملازمین کی مدد کرتے تھے۔ تمام ملازمین نہ صرف اُن کی عزت کرتے تھے بلکہ اُن کی صحت و تندرستی اور لمبی عمر کے لیے بھی دُعائیں کرتے رہتے تھے۔ دوسری طرف ملک طاہر کی بیوی فوزیہ بیگم کی طبیعت اپنے شوہر کے برعکس تھی۔ دولت نے اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ وہ ایک مغرور عورت تھی جو کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ یہی حال اُس کے دونوں بچوں راشد اور خالد کا تھا۔ باپ کے لاکھ سمجھانے کے باوجود فوزیہ بیگم اور اُن کے دونوں بچوں نے اپنی روش تبدیل نہ کی تھی وہ بات بات پر اپنے ملازمین کو ڈانٹتے تھے۔ اس کے برعکس مَلِک طاہر کا اپنے ملازمین کے ساتھ برتاؤ بہت اچھا تھا۔ وہ طبعًا ایک نیک دل اور شریف آدمی تھے اور اپنے اہل خانہ کو بھی ویسا ہی دیکھنا چاہتے تھے۔

ایک دن مَلِک طاہر اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اُن کا سیکریٹری سہیل کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ سہیل نے اُنھیں کل کی ضروری میٹنگز کے بارے میں بتایا اور جانے کی اجازت چاہی لیکن ملک صاحب نے اُسے روک لیا اور بولے:

''بھئی سہیل مجھے تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ آخر کیا بات ہے کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ۔''

''سر کوئی خاص بات نہیں سب ٹھیک ہے۔'' سہیل نے جواب دیا۔

''بھئی خاص نہیں تو عام ہی بتا دو۔'' ملک طاہر نے مسکراتے ہوئے کہا اور سہیل کو اپنی پریشانی کا سبب بتانا ہی پڑا۔

''سر آپ جانتے ہیں کہ میرے تین بچے ہیں، جن میں ایک بیٹا شکیل اور دو بیٹیاں ساجدہ اور شازیہ ہیں۔ بیٹیاں تو ابھی چھوٹی ہیں اور ابتدائی کلاسوں میں ہیں جب کہ بیٹا آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر چکا ہے اور اُس کے بہت اچھے نمبر آئے ہیں۔ میں اُسے کسی بڑے اور اچھے اسکول میں داخل کرانا چاہتا ہوں کیوں کہ وہ انتہائی ذہین اور باصلاحیت لڑکا ہے اور میں اُس کے مستقبل سے بہت پُر اُمید ہوں۔ لیکن میرے مالی حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ میں اپنے بیٹے کو کسی بڑے اسکول میں داخل کرا سکوں۔'' یہ کہہ کر سہیل خاموش ہوا۔ اس دوران مَلِک طاہر کا ڈرائیور اُن کے بڑے بیٹے راشد کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ملک طاہر نے سہیل سے اپنے بیٹے کا تعارف کروایا اور راشد بھی وہیں بیٹھ گیا۔ ملک طاہر

نے سہیل سے کہا: ''میرے بیٹے نے بھی حال ہی میں مڈل کا امتحان پاس کیا ہے میں نے اُس کا پرانا اسکول تبدیل کر کے شہر کے ایک شان دار اسکول میں داخلے کا بندوبست کیا ہے۔تم بھی اپنے بیٹے کو وہیں داخل کروادو۔داخلے کی رقم اور ماہانہ فیس میں ادا کروں گا اور یہ رقم تم سے واپس بھی نہیں لی جائے گی۔''

''سر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بڑے مہربان اور محبت کرنے والے انسان ہیں اور مجھے اپنے دوستوں کی طرح سمجھتے ہیں لیکن میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ میں تنخواہ کے علاوہ ایک پیسہ بھی زیادہ لوں۔'' سہیل نے احترام سے کہا۔

''لیکن بھئی یہ میں خود کہہ رہا ہوں۔تم اپنے بیٹے کے مستقبل کی بہتری کے لیے سوچو۔'' ملک طاہر نے گویا اپنا حکم سنا دیا۔

''سر اگر آپ مہربانی کرنا چاہتے ہیں تو یوں کریں کہ دفتر سے میری جمع شدہ رقم میں سے مجھے کچھ رقم پیشگی دے دیں اور ماہانہ فیس کی آدھی کٹوتی میری تنخواہ میں سے کریں اور جب سالانہ ترقی لگ جائے تو فیس کی ساری کٹوتی میری تنخواہ میں سے کر لیجیے گا۔ میں باقی قرض بھی جلد ادا کر دوں گا۔بس یہی آپ کا مُجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔سہیل نے دوٹوک الفاظ میں اپنا فیصلہ سُنا دیا اور ملک طاہر نے بھی گویا فیصلہ مانتے ہوئے سر ہلا دیا اور کہا۔

''جیسا تم چاہو ویسا ہی ہوگا۔'' وہ اپنے سیکریٹری سہیل کی خودداری سے اچھی طرح واقف تھے لہٰذا انھوں نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔دونوں کے درمیان ہونے والی یہ گفتگو وہاں بیٹھا ہوا ملک طاہر کا بیٹا راشد بھی سُن رہا تھا۔

اگلے دن سہیل کو دفتر سے مطلوبہ رقم مل گئی اور اُس نے اپنے بیٹے شکیل کو اُسی اسکول میں داخل کرا دیا جہاں ملک طاہر کا بیٹا راشد داخل تھا۔ اتفاق سے دونوں کی کلاس بھی ایک ہی تھی۔ شکیل اس بات سے واقف نہ تھا کہ راشد اُس کے والد کے باس کا بیٹا ہے مگر راشد اس بات سے آگاہ ہو چکا تھا کہ شکیل اس کے والد کے ملازم کا بیٹا ہے۔ شکیل اپنی ذہانت اور خداداد صلاحیتوں کی بنا پر جلد ہی اساتذہ کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ راشد کلاس میں ایک اوسط درجے کا طالب علم تھا اور شکیل سے اُسے خاص طور پر چڑ تھی۔ اساتذہ کی نظر میں شکیل کی بڑھتی ہوئی عزت کی وجہ سے وہ اندر ہی اندر حسد کی آگ میں جلنے لگا تھا۔ اس کے سر میں یہی سودا سمایا ہوا تھا کہ شکیل اس کے باپ کے دیے ہوئے پیسے سے پڑھ رہا ہے۔

ایک دن اردو کے استاد شہزاد صاحب کلاس میں طالب علموں کا کام چیک کر رہے تھے۔ جب شکیل کی کاپی اُن کے سامنے آئی تو اُنھوں نے حسبِ معمول اُس کی خوب صورت لکھائی کی تعریف کی اور ساری کلاس کو شکیل کی تقلید کرنے کی نصیحت کی کہ وہ شکیل سے کچھ سیکھنے کی کوشش کریں۔ باقی لڑکوں کی لکھائی بھی معمولی تھی۔ مگر راشد اور چند اور لڑکوں کی لکھائی تو انتہائی بری تھی۔ شہزاد صاحب اُن لڑکوں سے بہت ناراض ہوئے اور بولے، تم کلاس میں بھرپور توجہ نہیں دیتے۔ میرے خیال میں تمھیں شکیل کے ساتھ بیٹھ کر خوب صورت لکھنے کا ہنر سیکھنا چاہیے۔ راشد سے استاد کی یہ نصیحت برداشت نہ ہوئی۔ وہ تنک کر بولا:

''یہ مجھے کیا سکھائے گا۔ یہ تو میرے ابا جان کے نوکر کا بیٹا ہے اس کی تو فیس

بھی ہم ادا کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر راشد بے ڈھنگے طریقے سے ہنسنے لگا۔ شکیل کو اپنی توہین محسوس ہوئی۔ وہ اندر ہی اندر دکھی ہوگیا۔ اپنی بے عزتی پر اُسے غصہ تو بہت آیا مگر وہ خاموش رہا۔ شہزاد صاحب نے راشد کو یہ کہہ کر ڈانٹ دیا کہ اصل چیز تو ذہانت ہے اور اس میں روپے پیسے کا کوئی دخل نہیں۔

تمھارے والد اگر شکیل کے تعلیمی اخراجات برداشت کر رہے ہیں تو اس سے تم شکیل کی طرح قابل اور ذہین طالب علم نہیں بن سکتے۔ کیوں کہ مقام اور عزت تو تمھیں اپنی محنت کے بل بوتے پر ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ شہزاد صاحب کی ان باتوں سے شکیل کو کچھ حوصلہ ہوا، لیکن پھر بھی پریشانی برقرار رہی۔ گھر جا کر بھی اسے چین نہ آیا۔

شام کو جب اُس کے والد سہیل صاحب دفتر سے گھر واپس آئے تو شکیل نے

اپنے والد سے کہا:

''ابا جان میں آپ سے ایک بات پُوچھنا چاہتا ہوں۔''

''پوچھو بیٹے کیا پوچھنا چاہتے ہو۔''

''ابا جان آپ میرے اسکول کی فیس خود ادا کیوں نہیں کرتے اور آپ کے باس یہ رقم کس لیے دیتے ہیں؟'' شکیل نے پُوچھا۔

''بیٹا تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔ سہیل صاحب نے شکیل کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''لیکن ابا جان مجھے آج ہی پتا چلا ہے کہ میری کلاس میں پڑھنے والا لڑکا راشد دراصل آپ کے باس کا بیٹا ہے۔ اُس نے ساری کلاس کے سامنے یہ کہہ کر میری بے عزتی کی ہے کہ میری فیس اُس کے والد ادا کرتے ہیں۔ ابا جان آپ تو ہمیں غیرت کا سبق دیتے ہیں۔ پھر آپ نے یہ بات کیسے گوارا کر لی کہ کوئی غیر شخص آپ کے بیٹے کی فیس ادا کرے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ آپ مجھے معمولی اسکول میں داخل کرا دیتے۔'' شکیل بولتا چلا جا رہا تھا اور سہیل صاحب اپنے بیٹے کی خودداری پر حیران تھے۔ پھر انھوں نے بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''تمھاری فیس میرے باس ادا نہیں کر رہے اُنھوں نے مجھے ایسی پیشکش ضرور کی تھی، مگر میری غیرت نے گوارا نہیں کیا اور میں نے اپنے جمع شدہ فنڈ سے تمھارا داخلہ بڑے اسکول میں کروایا ہے۔ اب اپنی تنخواہ سے تمھاری فیس ادا کر رہا ہوں۔ اگر تمھیں یقین نہیں آتا تو اپنے اسکول کے اکاؤنٹ آفس سے پتا کر لو۔ تمھاری فیس

ادا کرنے اور گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے تو میں کبھی کبھی دفتر میں اوورٹائم بھی کر لیتا ہوں۔ سہیل صاحب نے تفصیلات بتائیں۔ اپنے والد کی باتیں سن کر شکیل کو اطمینان ہوا اور اس بات پر وہ شرمندہ بھی ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ اپنے والد کے متعلق برا گمان کیا تھا۔ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا:

''ابا جان مجھے معاف کر دیں آپ واقعی عظیم انسان ہیں جو سبق آپ نے ہمیں دیا ہے اُس کی زندہ مثال آپ خود ہیں۔ لیکن اب میں اُس اسکول میں نہیں پڑھوں گا۔ وہاں میری بے عزتی ہوئی ہے۔ کیوں کہ اگر میں وہاں پڑھتا رہا تو کبھی اپنی پڑھائی پر بھرپور توجہ نہیں دے سکوں گا۔ آپ مجھے دوسرے اسکول میں داخل کروا دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی لگن اور محنت سے ہر کلاس میں بہترین پوزیشن حاصل کروں گا۔ خدا نے چاہا تو مستقبل میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔'' شکیل کی یہ باتیں سُن کر سہیل صاحب نے اُسے گلے سے لگا لیا۔

اگلے ہی دن شکیل کو اُس کی خواہش کے مطابق ایک دوسرے نسبتاً کم فیس والے اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ شکیل نے دن رات محنت کر کے میٹرک میں ہائی فرسٹ ڈویژن حاصل کر لی۔ اسی طرح اس نے انٹر اور بی اے کے امتحانات میں بھی نمایاں نمبروں سے کامیابی حاصل کی اور سول سروسز کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ وہ ساری ساری رات جاگتا اور اکثر صبح کی اذان تک پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھتا۔ پھر وضو کر کے نماز پڑھتا اور چند گھنٹے سو جاتا تھا۔

امتحان سے فارغ ہو کر وہ نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے تمام پرچے نہایت

اچھے ہوئے تھے اور اسے یقین تھا کہ وہ امتحان میں بھرپور کامیابی حاصل کرلے گا۔ والدین کی دعائیں اور اُس کی محنت رنگ لائی۔ شکیل امتحان میں نمایاں پوزیشن کے ساتھ کامیاب ہوگیا تھا۔

شکیل کو حکومت نے درجۂ اول کے مجسٹریٹ کے عہدے پر تعینات کیا تھا۔ سہیل صاحب، ان کی بیوی اور بیٹیاں بہت خوش تھیں۔ اُنھوں نے سارے محلے اور رشتہ داروں اور دوست احباب میں مٹھائی تقسیم کی۔ سہیل صاحب نے اپنے دفتر کے ساتھیوں میں بھی مٹھائی تقسیم کی تھی جب وہ باس کے پاس پہنچے تو اُنھوں نے سہیل صاحب کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا:

''یہ تمھارا وہی بیٹا ہے جس کی غیرت اور خودداری کی وجہ سے آپ نے اس کا دوسرے اسکول میں داخلہ کروایا تھا؟''

''جی ..... جی سر یہ وہی شکیل ہے اور میرا اکلوتا بیٹا ہے۔'' سہیل صاحب نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''بھئی آج میں اس کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ ایک میرا بیٹا راشد ہے ..... یہ کہہ کر باس کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئے۔ سہیل نے پُوچھنا چاہا تو ملک طاہر نے کہا:

''میرے دونوں بیٹوں نے بمشکل میٹرک پاس کیا تھا اور اس کے بعد تعلیم چھوڑ دی تھی۔ بڑے بیٹے راشد نے تو سارے گھر کو پریشان کر رکھا ہے۔ سارا سارا دن آوارہ دوستوں کے ساتھ پھرتا ہے اور پیسے ضایع کرتا رہتا ہے۔ جب میں سمجھاتا ہوں کہ ایسی زندگی گزارنے کا انجام برا ہے تو میری بات پر توجہ نہیں دیتا۔ دراصل

میری بیوی نے اُس کی تربیت ہی ایسی کی ہے کہ وہ سیدھے راستے پر نہیں آتا۔ سہیل نے دیکھا کہ یہ کہتے ہوئے مَلِک طاہر آبدیدہ ہو گئے۔ ملک طاہر کے بالوں میں اب سفیدی جھلکنے لگی تھی اور اس عمر میں اولاد کا غم جو اُن کے بڑھاپے کو مزید بڑھائے جا رہا تھا، سہیل کو بھی غم زدہ کر گیا تھا۔

شکیل اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا، جہاں اُسے بہت سے عدالتی مقدموں کی کارروائی نمٹانا تھی۔ مختلف جرائم میں ملوث مجرم باری باری اُس کے سامنے آ رہے تھے۔ اسی دوران پولیس کے سپاہی تین نوجوانوں کو لے کر داخل ہوئے۔ یہ کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان تھے، جنھوں نے محض تفریح کے طور پر کسی شخص سے اُس کی گاڑی چھینی تھی اور فرار ہو گئے تھے۔ گشت کرتی ہوئی پولیس نے اُن کا تعاقب کر کے انھیں پکڑ لیا تھا۔ شکیل نے تینوں کی طرف دیکھا تو اُسے اُن میں ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ شکیل نے اُسے قریب بلایا تو وہ نوجوان شکیل کو پہچان کر شرمندہ ہو گیا۔ دراصل وہ مَلِک طاہر کا بیٹا راشد تھا اور دوسرے دو نوجوان اس کے ساتھی تھے۔ دوسرے نوجوانوں کے والدین وہاں پہنچ چکے تھے۔ لیکن راشد کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ ملک طاہر راشد سے بہت ناراض تھے اور اُس کی گرفتاری کی اطلاع ملنے پر بھی وہ اس سے ملنے نہیں آئے تھے۔ شکیل نے تھوڑی دیر سوچا اور خود راشد کی ضمانت کا بندوبست کر دیا۔ اور اُسے عدالت سے اپنے ساتھ لے کر ملک طاہر کے گھر پہنچ گیا۔ جہاں ملک طاہر بیٹے کی غلط تربیت اور اس کی بے جا حمایت کرنے پر اپنی بیوی سے جھگڑ رہے تھے۔ آج پہلی مرتبہ اُن کی بیوی فوزیہ بیگم

شرمندہ ہو رہی تھیں۔ راشد کو دیکھتے ہی ملک طاہر اُس پر برس پڑے۔ اُسی وقت سہیل صاحب بھی دفتر کے چند ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ وہاں آ کر سہیل صاحب نے جب اپنے بیٹے شکیل کو دیکھا تو وہ خاصے حیران ہوئے، لیکن چند لمحوں بعد ہی جب

ساری صورتِ حال واضح ہوئی تو انھوں نے شکیل کا تعارف ملک طاہر سے کروایا۔ ملک طاہر نے شکیل کو تعریفی نظروں سے دیکھا اور سب گھر والوں کو بتایا:

''شکیل بچپن سے ہی ایک خوددار، غیرت مند، اور ذہین انسان ہے۔ مُجھے ایسے نوجوانوں پر رشک آتا ہے اور اپنے بیٹے کو بیٹا کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

راشد جواب تک خاموش تھا یہ گفتگو سن کر دل ہی دل بہت شرمندہ ہو رہا تھا۔ اُس نے سب لوگوں کے سامنے نہ صرف اپنے والدین سے معافی مانگی بلکہ برسوں پہلے شکیل سے کی ہوئی زیادتی پر بھی شرم سار ہوا۔ شکیل جو ماضی کی ساری تلخیوں کو بھُول کر راشد کو اپنے ساتھ یہاں لایا تھا، آگے بڑھا اور اُسے گلے سے لگا لیا۔

مسلمان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مُسلماں

انسپکٹر شوکت مرزا محکمہ پولیس کے ذہین، ایمان دار اور فرض شناس افسروں میں سے ایک تھے۔ وہ نہ صرف ایک بہادر، قابل اور محبِ وطن انسان تھے بلکہ وہ جذبۂ ایمانی کی قُوّت سے بھی مالا مال تھے۔ یہ قوت اُنھیں مشکل سے مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیتی تھی۔ اُنھوں نے اپنی ذہانت، فہم و فراست اور بہترین منصوبہ بندی سے بڑے بڑے اُلجھے ہوئے کیسوں کی گُتھیاں سُلجھا دی تھیں۔ وہ مجرموں کو گرفتار کرتے ہوئے خود بھی کئی مرتبہ زخمی ہو چکے تھے لیکن ہمیشہ موت کے خوف سے بے پروا ہو کر اپنے فرائض پوری ایمان داری اور اللہ کے بھروسے پر ادا کیے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر فرض پورا کرتے ہوئے میری جان بھی چلی جائے تو وطن کی عزت و آبرو بچانے کے لیے یہ سودا مہنگا نہیں۔ انسپکٹر شوکت مرزا کی بیوی ثمینہ بیگم اُن سے اکثر کہا کرتیں کہ پولیس کی نوکری چھوڑیں اور گاؤں کی بنجر پڑی زمین میں کھیتی باڑی کریں۔ لیکن انسپکٹر شوکت مسکرا کر جواب دیتے :

''خدا نے مجھے ایک فرض کی ادائیگی پر مامور کیا ہے۔ میں اپنا فرض اُس وقت تک پورا کروں گا جب تک میرے بازوؤں میں دم ہے۔'' انسپکٹر شوکت کی یہ باتیں

سن کر ثمینہ بیگم خاموش ہو جاتیں، لیکن چند روز کے بعد پھر نصیحت کرنے لگتیں۔

شوکت مرزا کے دو بچے تھے۔ ماجد اور جمیل۔ وہ دونوں جب بھی اپنے ابو کے کارنامے سنتے تو ان کے دل میں بھی اپنے وطن کی خدمت کا جذبہ بیدار ہو جاتا۔ یہ دونوں بچے ذہین اور نیک تھے۔ پانچ وقت نماز پڑھنے کے علاوہ تلاوتِ قرآن حکیم کے بھی پوری طرح پابند تھے۔ اُنھیں یہ خصوصیت ورثے میں ملی تھی۔ دونوں نے شروع ہی سے اپنے والدین کو دین کی طرف راغب پایا تھا۔

پچھلے چند دن سے انسپکٹر شوکت مرزا منشیات کے بہت بڑے اسمگلروں کے تعاقب میں تھے۔ انھیں اس سلسلے میں اب تک مجرموں کا کوئی سُراغ نہیں مل سکا تھا، جس کی وجہ سے وہ خاصے پریشان تھے۔ دراصل پچھلے کئی ماہ سے شہر کے مختلف کالجوں اور اسکولوں میں پڑھنے والے بچے منشیات کے عادی ہو رہے تھے۔ شروع شروع میں منشیات فروش یہ نشہ آور اشیاء کھانے پینے کی مختلف چیزوں میں ڈال کر بچوں کو دیتے رہے۔ بعد میں اپنے کارندوں کے ذریعے تقسیم کرنے لگے۔ والدین کو اپنے بچوں کی گرتی ہوئی صحت پر تشویش ہوئی تو اُنھوں نے ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ ڈاکٹروں نے ضروری چیک اپ اور ٹیسٹ کرنے کے بعد بچوں میں نشے کے زہر کا سراغ لگالیا۔ اس سلسلے میں والدین کی طرف سے شکایتیں پولیس ہیڈ کوارٹر تک پہنچیں۔ جس کے بعد پولیس نے کارروائی کی، مگر تا حال کوئی مجرم گرفتار نہیں ہو سکا تھا۔ نشے کا یہ جال ایک اسکول سے دوسرے اسکول اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ حکومت بھی اس سلسلے میں بہت پریشان تھی۔ حکومت نے یہ معاملہ

انسپکٹر شوکت مرزا کے سپرد کیا۔

پہلے چند تعلیمی اداروں کے ملازمین گرفتار کر لیے گئے۔ لیکن یہ وہ لوگ تھے جو چند روپوں کے لالچ میں یہ زہر تقسیم کر رہے تھے۔ اصل میں اُن کے پیچھے کوئی اور تھا اُنھوں نے ذرا سی سختی کرنے پر بتا دیا کہ اُنھیں کوئی شخص ہیروئن کا ایک بڑا پیکٹ دے کر چلا جاتا ہے۔ ہمیں ہر ہفتے ہمارا معاوضہ مل جاتا ہے۔

انسپکٹر شوکت مرزا نے اُن لوگوں کی گرفتاری اور سارے معاملے کو راز میں رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اخبار میں اُن کی گرفتاری کی کوئی خبر شائع نہ ہوئی۔ گرفتار ہونے والے اسکول ملازمین کو اعتماد میں لے کر اس شرط پر عارضی طور پر رہا کر دیا گیا کہ اگر وہ اصل مجرموں کی گرفتاری میں قانونی مدد کریں گے تو اُنھیں ہمیشہ کے لیے رہا کر دیا جائے گا۔ رہائی ملنے پر سب خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تاکہ مجرم بے خبری میں پکڑے جائیں۔ انسپکٹر شوکت مرزا شہر کے تمام تعلیمی اداروں کے اردگرد سادہ لباس میں اپنی پولیس فورس کا جال پھیلا چکے تھے۔ جب کئی دن گزرنے کے باوجود بھی وہاں کوئی منشیات فروش نہ آیا تو اُنھیں مایوسی اور تشویش ہوئی۔ انسپکٹر شوکت سوچنے لگے کہ آخر مجرموں کو پولیس کی سرگرمیوں کی اطلاع کیسے ہوئی؟

ایک دن انسپکٹر شوکت مرزا معمول کے مطابق اپنے گھر واپس جا رہے تھے کہ اُن کے وائرلیس سیٹ کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اُنھوں نے وائرلیس سیٹ کان سے لگا لیا اور پیغام سننے لگے۔ دوسری طرف سے سب انسپکٹر مسعود بول رہے تھے۔

''سر! ہمیں اطلاع ملی ہے کہ شاہین لائنز کے قریب ایک بڑی سی کوٹھی میں سفید ڈاڑھی والا بُوڑھا شخص اندر داخل ہوا ہے اور اپنی حرکات وسکنات سے وہ مشکوک لگ رہا ہے۔ سر اس علاقے میں تین بڑے اسکول اور ایک کالج ہے۔ جہاں کے بہت سے طلبہ نشے سے متاثر ہوئے ہیں۔'' یہ خبر دے کر سب انسپکٹر مسعود چپ ہوگئے۔ انسپکٹر شوکت نے انسپکٹر مسعود کو اپنی پولیس فورس کے ساتھ اسی جگہ پہنچنے کو کہا اور خود بھی وہیں روانہ ہوگئے۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد جب وہ وہاں پہنچے تو سب انسپکٹر مسعود اپنی پولیس فورس کے ساتھ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ انسپکٹر شوکت نے اُنھیں کوٹھی کے قریب چلنے کو کہا۔ یہ قافلہ خاموشی سے اُس کوٹھی کی طرف روانہ ہوگیا جہاں کچھ دیر پہلے ایک پُر اسرار بُوڑھا داخل ہوا تھا۔ انسپکٹر شوکت نے دروازے پر دستک دی تو ایک نوجوان باہر نکلا اور اپنے سامنے پولیس کو دیکھ کر کر ڈر گیا۔ پھر قدرے سنبھل کر بولا:

''جج ..... جی ..... کک ..... کیا بات ہے۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں .....؟''

''ہمیں گھر کے کسی بزرگ سے ملنا ہے۔ اپنے ابا جان کو بلاؤ۔'' انسپکٹر شوکت مرزا ذرا سخت لہجے میں بولے تو نوجوان گھبرا گیا اور بولا:

''لیکن ..... ابا جان گھر میں نہیں ہیں۔''

''لیکن ابھی ابھی ایک بوڑھا شخص کوٹھی میں داخل ہوا ہے۔ وہ تمھارا کیا لگتا ہے۔'' سب انسپکٹر مسعود نے ذرا سختی سے پوچھا۔

''وہ..... بوڑھا..... جی وہ میرے دادا جان ہیں۔'' نوجوان خوف زدہ ہوکر بولا۔ اُس کے چہرے سے جھوٹ نمایاں تھا۔

''کوئی بات نہیں، ہم تمھارے دادا جان ہی سے مل لیتے ہیں۔'' انسپکٹر شوکت نے یہ کہہ کر نوجوان کو پیچھے ہٹایا اور اندر داخل ہوگئے۔ نوجوان لڑکے نے اُنھیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن انسپکٹر مسعود اُسے اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں اُنھوں نے ساری کوٹھی چھان ماری لیکن اُنھیں اس نوجوان کے علاوہ وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ انسپکٹر شوکت نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے انتہائی سخت لہجے میں بولے:

''کہاں ہیں تمھارے دادا جان..... تمھیں پتا ہے کہ قانون کے ساتھ مذاق کرنے کی سزا کتنی کڑی ہے.....؟''

''بھئی..... کہیں..... چل..... چلے گئے ہوں گے۔ مجھے کیا معلوم.....آ..... خر.....آپ کیا چاہتے ہیں؟'' نوجوان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ انسپکٹر شوکت کے سخت لہجے نے اُسے مزید خوف زدہ کردیا تھا۔

''کہاں چلے گئے تمھارے دادا جان..... ہم نے تو اُنھیں گیٹ سے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' انسپکٹر شوکت مرزا نے صاف محسوس کیا کہ وہ نوجوان لڑکا اُن کے ساتھ غلط بیانی کررہا ہے اور اصل معاملہ کچھ اور ہے۔ یہ سوچ کر اُنھوں نے اُسے پولیس کے حوالے کیا اور خود نئے سرے سے کوٹھی کی تلاشی لینے لگے۔ مختلف کمروں سے گزرتے ہوئے جب وہ ایک کمرے میں پہنچے تو اُنھیں خاصی حیرانی ہوئی کہ باقی

کمرے تو صاف ستھرے تھے مگر یہ کمرہ کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ پہلی بار تلاشی پر تو اُنھوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی مگر اس بار اُنھیں محسوس ہوا کہ اس بڑے کمرے کو اسٹور کے طور پر استعمال کرنے میں یقیناً کوئی راز ہے۔ چناں چہ اُنھوں نے پورے کمرے کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کمرے میں دو پرانی الماریاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ایک ایک الماری کے خانے کھول کر دیکھے، لیکن اُنھیں کوئی ایسا سُراغ نہ مل سکا جو اُن کی رہنمائی کر سکے۔ اچانک اُن کی نظر ایک الماری میں بے ترتیبی سے رکھے ہوئے کپڑوں پر پڑی۔ اُنھوں نے اُن کپڑوں کو اٹھایا تو اُن میں سے نقلی سفید ڈاڑھی اور مونچھیں نکل کر زمین پر آ گریں۔ اُنھوں نے سب انسپکٹر مسعود کی طرف دیکھا اور بولے:

''یہ سب کیا ہے؟ کہیں یہ نقلی ڈاڑھی مونچھیں اُس نوجوان کی تو نہیں۔ اُس سے پوچھتے ہیں۔''

''لیکن سر اُسے تو میں نے دو سپاہیوں کے ساتھ پولیس اسٹیشن بھیج دیا ہے۔'' انسپکٹر مسعود بولے۔

''چلو پھر وہیں چلتے ہیں۔ مجھے اُس پر اپنے طریقے سے سختی کرنی پڑے گی تا کہ کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔'' انسپکٹر شوکت مرزا یہ کہہ کر دوبارہ اُسی الماری کا جائزہ لینے لگے۔ اچانک اُن کا ہاتھ الماری کے اندر ہی اُبھرے ہوئے ایک بٹن سے جا ٹکرایا جسے اُنھوں نے دبا دیا۔ فوراً ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی اور سامنے والی دیوار میں خلا پیدا ہو گیا۔ انھوں نے جھانک کر دیکھا تو نیچے تہ خانے میں

سیڑھیاں جاتی ہوئی نظر آئیں۔ انسپکٹر شوکت نے اپنی جیب سے ٹارچ نکال کر روشنی کی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگے۔ سب انسپکٹر مسعود اور چند دوسرے سپاہی بھی اُن کے ساتھ تھے۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک راستہ دور تک چلا گیا تھا۔ انسپکٹر شوکت نے اپنے ساتھیوں کو رُکنے کا اشارہ کیا اور سب انسپکٹر مسعود کو لے کر آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ جب قریب پہنچے تو اُنھیں ایک چھوٹا سا کمرہ نظر آیا۔ انسپکٹر شوکت مرزا خاصے حیران ہو رہے تھے کہ کوٹھی کے نیچے سے ہوتا ہوا یہ راستہ آخر کہاں تک جاتا ہے۔ بہر حال یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ لہٰذا وہ سب انسپکٹر مسعود کو اشارے سے وہیں کھڑا کر کے دبے پاؤں چلتے ہوئے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ دروازہ شاید اندر سے بند تھا اور کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

''یار باہر بہت سختی ہے۔ چاروں طرف پولیس کے آدمی سادہ لباس میں موجود ہیں۔ سپلائی بھی رُک گئی ہے۔ باس بھی سخت ناراض ہو رہا ہے۔'' ایک آواز آئی۔

''انسپکٹر شوکت نہ جانے کیا چیز ہے۔ انتہائی تیز آدمی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ ہمارے اڈّے تک نہ پہنچ جائے۔'' دوسری آواز ابھری۔

''اُس کا تو باپ بھی ہماری جگہ کا پتا معلوم نہیں کر سکتا۔'' تیسری آواز آئی۔

''یار شکر کرو ہمارا آدمی پولیس میں ہے جو ہمیں ان خطروں سے آگاہ کر دیتا ہے۔ ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی۔'' پہلی آواز پھر آئی۔

'' یار یہ سب انسپکٹر کاشف آخر قابو میں کیسے آ گیا۔'' انسپکٹر شوکت کے کان

کھڑے ہو گئے۔ وہ سب انسپکٹر کاشف سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اُس جیسا شریف آدمی ملک دشمن عناصر کے ساتھ بھی مل سکتا ہے۔

''بھئی پیسہ سب کچھ خرید لیتا ہے۔ لیکن سُنا ہے کہ انسپکٹر شوکت مرزا کو کوئی نہیں خرید سکتا۔'' تیسری آواز آئی۔

''باس کہتا ہے کہ اُسے خریدنے کی کوشش کرو، ورنہ اُس کے لیے گولی تیار رکھو۔'' ایک آواز آئی۔

انسپکٹر شوکت مرزا نے یہ گفتگو سُنی تو دبے قدموں واپس پلٹ آئے اور سب انسپکٹر مسعود سے سرگوشی کی۔ سب انسپکٹر مسعود نے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور سب پوری طرح چوکنا ہو کر کسی بھی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ انسپکٹر شوکت مرزا نے اپنی ٹارچ سب انسپکٹر مسعود کے حوالے کی اور خود کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے اور اُس کے قریب پہنچ کر پوری طاقت سے دروازہ کھول دیا۔ اندر سے چٹخنی لگی ہوئی نہیں تھی۔ انسپکٹر شوکت نے اندر داخل ہوتے ہی تینوں مجرموں پر پستول تان لیا اور سخت لہجے میں بولے:

''خبردار..... اپنے ہاتھ اُوپر اٹھا دو۔ ذرا سی حرکت بھی تمھاری جان کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔'' کمرے میں موجود تینوں مجرم انسپکٹر شوکت کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئے اور اُنھوں نے بے ساختہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ کیوں کہ اُس وقت اُن کے پاس اسلحہ نہ تھا اور ذرا سی مزاحمت بھی اُنھیں نقصان پہنچا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد انسپکٹر مسعود نے اُنھیں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ پولیس اسٹیشن

پہنچ کر اُن پر سختی کی گئی لیکن اُنھوں نے اپنے اصل اڈے کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ انسپکٹر کاشف کو بھی مجرموں کا ساتھ دینے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ لیکن کاشف نے صرف اتنا بتایا کہ اُس نے پیسے کے لالچ میں پولیس کی چند سرگرمیوں سے مجرموں کو آگاہ کیا تھا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ انسپکٹر شوکت جلد از جلد اُن کے سرغنہ اور دوسرے ساتھیوں کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔

انسپکٹر شوکت مرزا گھر پہنچے تو خاصی رات ہو چکی تھی اور بیوی بچے اُن کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے اہلِ خانہ کو ساری صُورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد رات کا کھانا کھایا اور عشاء کی نماز پڑھ کر سو گئے۔ صبح وہ فجر کی اذان سے بھی پہلے بیدار ہو گئے۔ نماز پڑھنے کے بعد تلاوتِ قرآن پاک کی اور کافی دیر تک اللہ تعالیٰ سے تمام مجرموں کی گرفتاری کی دُعا کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ معمول کے مطابق صبح کی سیر کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب وہ واپس گھر پہنچے تو ناشتہ تیار تھا اور اُن کے دونوں بچے اسکول جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

ناشتہ کرنے کے بعد انسپکٹر شوکت مرزا پولیس اسٹیشن پہنچے تو سب انسپکٹر مسعود پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے انسپکٹر شوکت کو بتایا کہ مجرموں کی تلاشی کے بعد ہم نے اُن سے ہر چیز لے لی تھی، لیکن ایک مجرم کے جوتوں کے نیچے جدید طرز کا انتہائی چھوٹا موبائل فون رہ گیا تھا، جس کے ذریعے اُس نے اپنے باس کو گرفتاری کی خبر دے دی تھی۔ ہم نے اُس سے موبائل تو چھین لیا لیکن کوشش کے باوجود ابھی تک نمبر

تلاش نہیں کیا جا سکا۔ خدا جانے موبائل میں کیا سسٹم تھا کہ اس نے فون کرنے کے بعد وہ نمبر ہی غائب کر دیا۔ یہ کہہ کر سب انسپکٹر مسعود نے انسپکٹر شوکت کو ایک چھوٹا سا موبائل دکھایا۔ جو اُنھوں نے مجرموں سے حاصل کیا تھا۔

مجرموں پر سختی کرنے کے باوجود ان کے باس کے متعلق کچھ بھی پتا نہ چل سکا تھا۔ نوجوان لڑکے سمیت باقی مجرم بڑے ہی سخت جان ثابت ہو رہے تھے۔ انسپکٹر شوکت مرزا نے سب انسپکٹر کو ہدایت کی کہ وقتی طور پر ان کا کھانا بند کر دیا جائے۔ شاید بھوک سے بے تاب ہو کر یہ اپنے باس اور اُس کے اڈے کے بارے میں بتا دیں۔ یہ حکم دے کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

انسپکٹر شوکت مرزا پولیس اسٹیشن میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے ریسیور اُٹھایا تو دوسری جانب سے کوئی انتہائی کرخت لہجے میں بول رہا تھا:

''انسپکٹر!..... تمھارا چھوٹا بیٹا اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ اگر تمھیں اس کی زندگی عزیز ہے تو میرے آدمی چھوڑ دو۔ ورنہ بیٹے کی لاش وصول کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ذرا اپنے بیٹے سے بات کر لو۔'' اس کے ساتھ ہی کرخت آواز آنا بند ہو گئی اور دوسرے ہی لمحے اُنھیں اپنے بیٹے جمیل کی آواز سنائی دی جو کہہ رہا تھا۔

''ابا جان میں اور ماجد بھائی اسکول سے واپس گھر آ رہے تھے کہ ان لوگوں نے اسلحہ دکھا کر مجھے اغوا کر لیا لیکن آپ میری فکر نہ کریں اور ان تک پہنچنے کی کوشش کریں انھوں نے مجھے ایک ویران سی جگہ میں رکھا ہُوا ہے.....'' جمیل نے اتنا ہی کہا

تھا کہ کسی نے اُس کے ہاتھ سے فون چھین لیا۔ انسپکٹر شوکت مرزا اپنی زندگی میں بارہا مشکل حالات سے گزرے تھے اور اکثر اُنھوں نے زندگی اور موت کی جنگ لڑی تھی۔ مگر یہ پہلا موقع تھا کہ اُن کی بجائے بیٹے کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اُنھوں نے فوری طور پر سب انسپکٹر مسعود کو نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا، جس پر وہ بھی خاصے پریشان ہو گئے۔

جمیل کی بازیابی کے لیے ابھی وہ کوئی لائحہ عمل اختیار کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے اپنی مخصوص کرخت دار آواز میں وہی شخص بول رہا تھا:

''کیوں انسپکٹر کیا سوچا ہے؟ میرے آدمی رہا کر رہے ہو یا تمھیں بیٹے کی لاش چاہیے؟''

یہ سُن کر انسپکٹر شوکت طیش میں آ گئے اور بولے: ''تم کوئی انتہائی مکروہ قسم کے آدمی ہو، جس نے یہ گھٹیا چال چلی ہے۔ میں کسی قیمت پر بھی تمھارے آدمی رہا نہیں کر سکتا۔ میں ایک نہیں کئی بیٹے قربان کر سکتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اُنھوں نے ٹیلی فون پٹخ دیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

گھر پہنچے تو بیٹے کے اغوا کی وجہ سے بیگم کا بُرا حال تھا۔ رو رو کر ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ لہٰذا اُنھیں دیکھتے ہی بولیں:

''میں نہ کہتی تھی، یہ نوکری چھوڑ دیں۔ یہ موت کا کھیل ہے۔ اگر میرے بیٹے کو کچھ ہو گیا تو میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔''

''دیکھو بیگم، صبر کرو، مجھے سب کچھ پتا چل گیا ہے کہ یہ کن لوگوں کی سازش ہے۔ خدا پر یقین رکھو۔ وہ مشکلات حل کرنے والا ہے۔'' انسپکٹر شوکت بیگم کو کچھ دیر تسلی دیتے رہے اور واپس پولیس اسٹیشن کے لیے گھر سے روانہ ہوگئے۔ اُنھوں نے سب انسپکٹر مسعود کو ساتھ لیا اور منشیات کیس کے سلسلے میں گرفتار ہونے والے چاروں مجرموں کے پاس پہنچ گئے۔ ان پر سختی کرنے اور انھیں بھوکا رکھنے کے باوجود ان کے گروہ اور باس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ انسپکٹر شوکت نے ان مجرموں پر آخری حربہ آزمانے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے ایک مجرم کو اپنے قریب کھینچتے ہوئے خاص طریقے سے ہاتھ کی پوری قوت سے اُس کا پیٹ پکڑ کر دبا دیا۔ یہ بظاہر عام سا لیکن درحقیقت انتہائی سخت حربہ تھا۔ اس حربے کے نتیجے میں مجرم کی چیخیں نکل گئیں۔ انسپکٹر شوکت نے باری باری چاروں مجرموں پر یہی تکلیف دہ عمل آزمایا۔ مجرموں کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے ان کا پیٹ پھٹ چکا ہے اور کسی لمحے بھی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی۔ انسپکٹر شوکت نے دوبارہ یہ عمل دہرایا تو چاروں مجرم درد کی شدت سے زمین پر گر کر تڑپنے لگے اور اُنھوں نے اپنے باس اور اُس کے اڈے کا پتا بتا دیا۔ یہ شہر سے دور ایک ویران علاقہ تھا، جہاں باس اپنے ساتھیوں کے ساتھ منشیات کا کاروبار کرتا تھا۔ انسپکٹر شوکت نے درد سے کراہتے ہوئے مجرموں کو وہیں چھوڑا اور سب انسپکٹر مسعود کے ساتھ پولیس کی بھاری جمعیت لے کر اڈے کی طرف روانہ ہوگئے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ اس ویران علاقے میں پہنچ گئے، جہاں ایک پُرانی

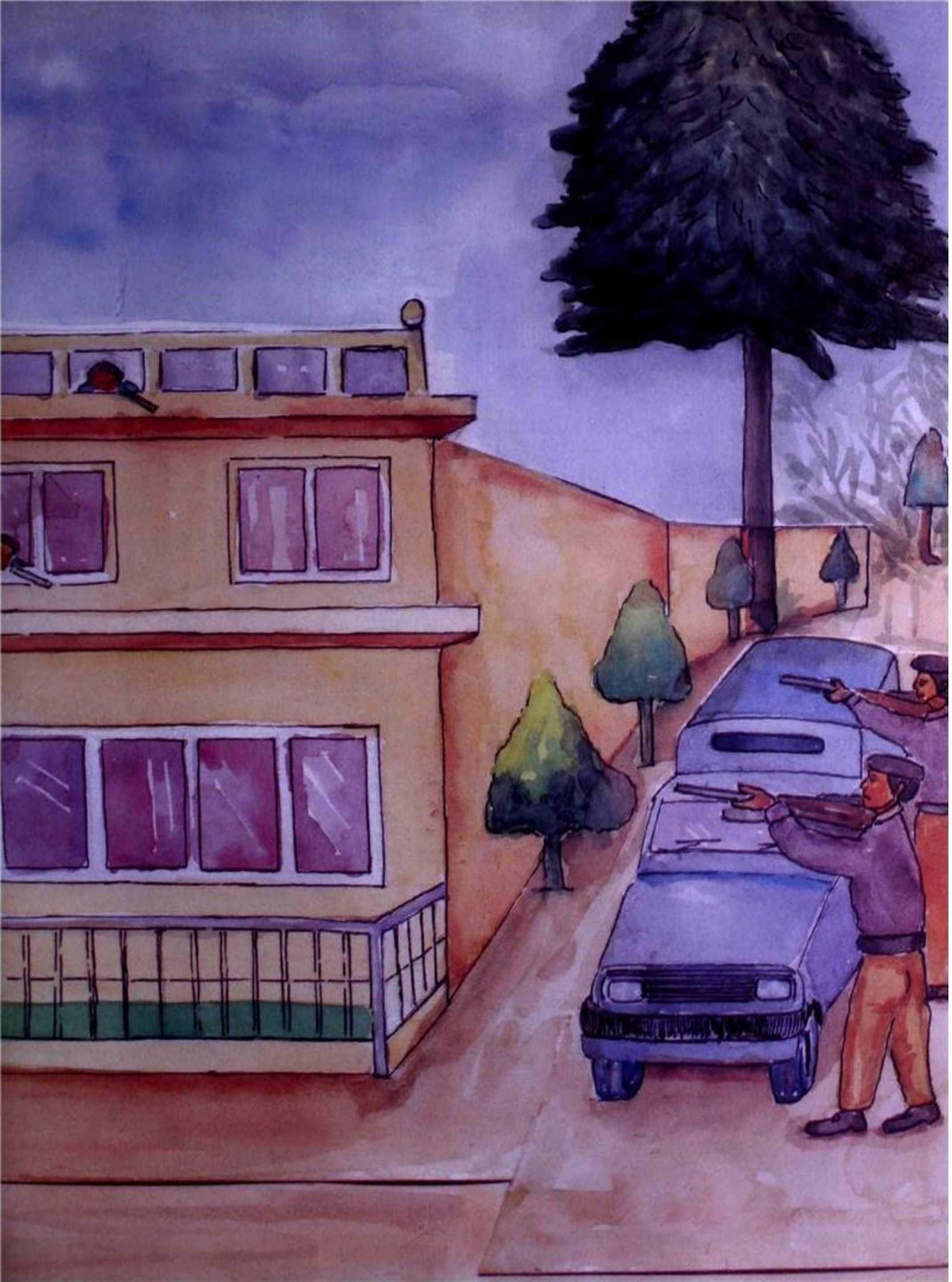

حویلی میں باس اپنے ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ انسپکٹر شوکت کی ہدایت پر تھوڑی ہی دیر میں خاموشی کے ساتھ حویلی کا گھیراؤ کرلیا گیا۔ منصوبے کے مطابق انسپکٹر شوکت چند ساتھیوں کے ساتھ حویلی کے اندر داخل ہوگئے۔ لیکن مجرم بھی پوری طرح چوکنا ہو چکا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی انسپکٹر شوکت اندر داخل ہوئے، ایک فائر ہوا اور سنسناتی ہوئی گولی انسپکٹر شوکت کے قریب سے گذر گئی۔ اُنھوں نے بھی فائرنگ شروع کردی۔ اس دوطرفہ فائرنگ کے نتیجے میں ایک گولی انسپکٹر شوکت کے بازو میں لگی۔ انسپکٹر شوکت نے صورتِ حال دیکھتے ہوئے اپنے منہ سے مخصوص قسم کی آواز نکالی۔ یہ انسپکٹر مسعود اور ان کے ساتھیوں کے لیے اشارہ تھا کہ وہ بھی حویلی میں داخل ہوجائیں۔ اشارہ ملتے ہی سب انسپکٹر مسعود بھی پولیس کی بھاری تعداد لے کر حویلی میں داخل ہوگئے۔ اس کے بعد حویلی میں چاروں طرف سے گولیوں کا تبادلہ شروع ہوگیا اور کئی افراد شدید زخمی ہوکر گر پڑے۔ پولیس کی بھاری تعداد کا مقابلہ مجرموں کے لیے بہت مشکل ہوگیا، لہٰذا ایک گھنٹے کی شدید فائرنگ کے بعد مجرموں نے ہتھیار ڈال دیے۔ مجرموں میں ایک شخص کے چہرے پر نقاب تھا۔ انسپکٹر شوکت نے نقاب ہٹا کر دیکھا تو وہ حیران رہ گئے۔ سامنے ملک کا معزز اور دولت مند شخص سیٹھ امین تھا۔ انسپکٹر شوکت نے بڑے اثر ورسوخ رکھنے والے مجرموں کو بھی کیفرِ کردار تک پہنچایا تھا۔ اس لیے اُنھیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ مجرم کتنا طاقت ور ہے اور وہ کہاں کہاں اپنے تعلقات کو استعمال کرسکتا ہے۔ اس لیے اُنھیں سیٹھ امین کو گرفتار کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوا اور فوراً اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا کر سب انسپکٹر مسعود کے

حوالے کر دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر انسپکٹر شوکت حویلی کے مختلف کمروں میں اپنے بیٹے جمیل کو تلاش کرنے لگے۔ جب وہ ایک کمرے کے قریب پہنچے تو اُس پر باہر سے تالا لگا ہوا تھا اور اندر سے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ اُنھوں نے پوری قوت سے دھکا مار کر دروازہ ہی توڑ دیا۔ اندر داخل ہوئے تو جمیل کو شدید زخمی حالت میں رسیوں سے بندھا ہوا پایا۔ انسپکٹر شوکت نے اُسی لمحے جمیل کے زندہ بچ جانے پر خُدا کا شکر ادا کیا اور اُسے رسیوں سے آزاد کر دیا۔ مجرموں نے اُس پر بہت تشدد کیا تھا اور وہ اس وقت درد سے کراہ رہا تھا۔ سب انسپکٹر مسعود نے جب جمیل کو اس حالت میں دیکھا تو

مجرموں پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔

''ظالمو! یہ تم نے بچے کا کیا حال بنا دیا ہے''..... لیکن انسپکٹر شوکت نے یہ کہہ کر اُن کا ہاتھ روک لیا کہ یہ ہمارا نہیں قانون کا کام ہے۔ وہ انھیں جس طرح چاہے سزا دے۔

''لیکن سر! انھوں نے آپ کے بیٹے پر بہت تشدد کیا ہے۔ میں ان کی کھال کھینچ لوں گا۔'' سب انسپکٹر مسعود نے جذباتی ہو کر کہا۔

''ٹھیک ہے، لیکن یہ وقت جذباتی ہونے کا نہیں۔ یہ وطنِ عزیز کا معاملہ ہے اور ہمیں وطن رشتے سے زیادہ عزیز ہونا چاہیے۔ پھر اسلام بھی ہمیں دشمن سے اچھے سلوک کی تلقین کرتا ہے۔ جمیل پر تشدد کر کے اُنھوں نے جو پریشانی اور ذہنی اذیت مجھے دی ہے۔ میں اس کے لیے اُنھیں معاف کرتا ہوں، لیکن جہاں تک ان کی ملک دشمنی کا تعلق ہے تو اُنھیں سخت سے سخت سزا دلوانے کی کوشش کروں گا۔ یہ چند لوگ نہیں بلکہ پوری مافیا ہے ہمیں بہت جلد منشیات کے کاروبار میں ملوث دوسرے لوگوں تک بھی پہنچنا ہے تاکہ ملک اور نئی نسل کو اس زہر سے بچایا جا سکے۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر شوکت خاموش ہو گئے۔

مجرموں کو پولیس کی گاڑیوں میں ڈال کر تھانے روانہ کر دیا گیا۔ انسپکٹر شوکت جمیل کو ایک گاڑی میں ہسپتال لے گئے، جہاں ابتدائی طبّی امداد کے بعد اُس کی حالت قدرے بہتر ہو چکی تھی۔

اگلے دن اخبارات میں انسپکٹر شوکت اور ان کے ساتھیوں کی بہادری کے

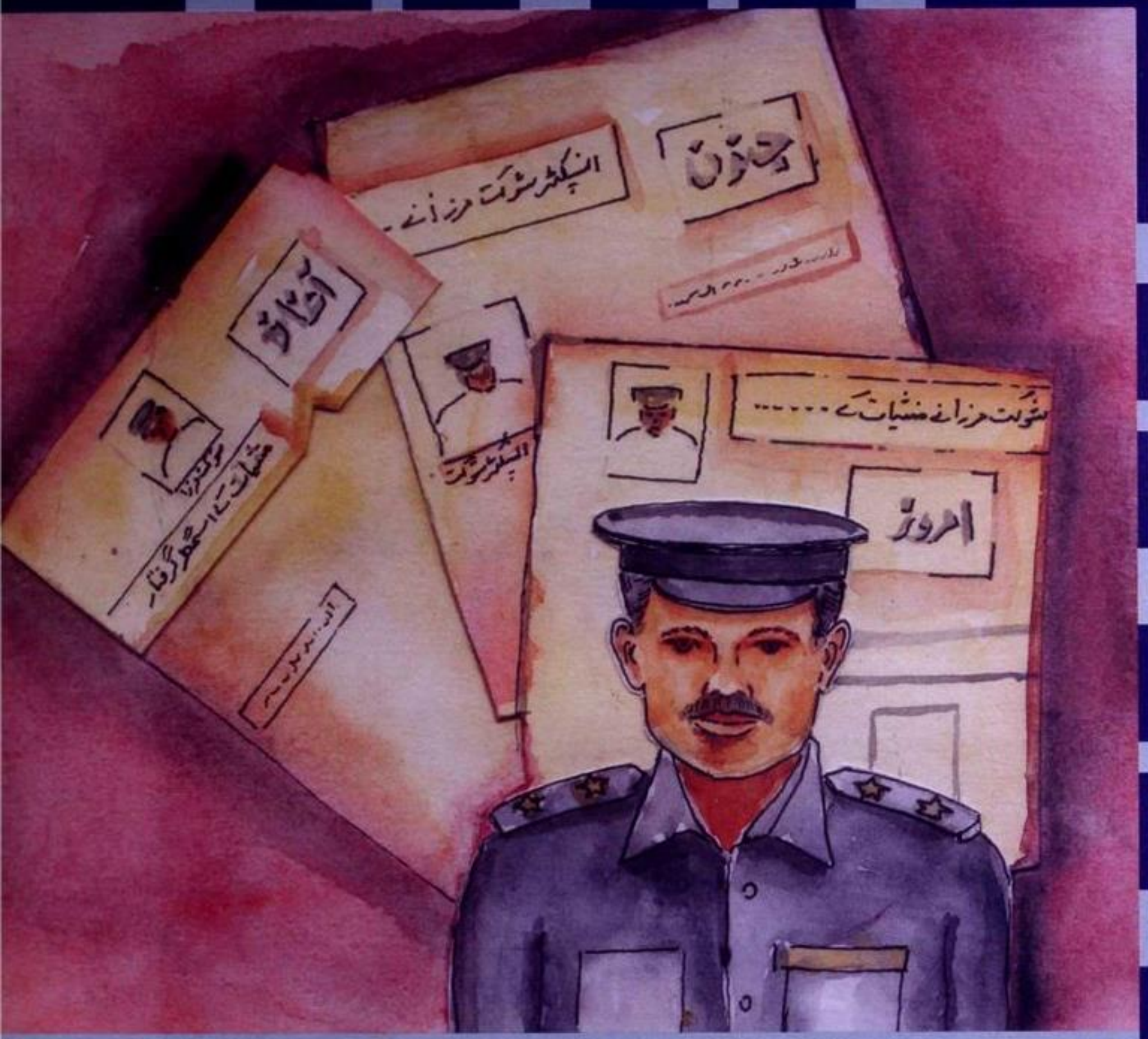

کارنامے شہ سرخیوں کے ساتھ ملک کے تمام اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ اُنھیں حکومت کی طرف سے انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا تھا۔ انسپکٹر شوکت کے لیے سب سے بڑا انعام وہ خوشی اور اطمینان تھا جو وطن دشمن عناصر کو گرفتار کرنے پر حاصل ہوا تھا۔

اقبال اکادمی پاکستان